افسانوی مجموعہ

فیصلہ ابھی باقی ہے

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

فیصلہ ابھی باقی ہے

افسانوی مجموعہ

ڈاکٹر محمد شفیع ایازؔ

(C) جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب: فیصلہ ابھی باقی ہے

مصنف: ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

صنف: افسانے

سن اشاعت: ۲۰۱۶ء

قیمت: Rs 300/-

طباعت: المختار پبلی کیشنز اسلام آباد کشمیر

کتاب ملنے کا پتہ

کتاب گھر: لال چوک سرینگر

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز: اقبال آباد: کے پی روڈ انت ناگ

Mobile: 9419040604

اِنتساب

بیتے ہوئے لمحوں کے نام

(یہ الفاظ جن کے زیرِ ہدایت ہیں)

اُس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا

کہ کسی کا ساتھ چھوڑنے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ

کہیں زمانے میں کبھی اُس سے آنکھیں نہ ملانی پڑیں۔

ڈاکٹر محمد شفیع ایازؔ

..... آپ کو ایک بات بتاؤں کہ بعض اوقات انسان تمام عمر کسی خواہش کی خاطر جی لیتا ہے کہ اس خواہش پر اسکی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہی خواہش اُس کی انا کا مسلہ بن جاتی ہے اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ چُپ چاپ کسی دن جب خواہش پوری کرنے کا وقت آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی انجانے لمحے میں وہ خواہش اُس سے بچھڑ گئی ہے. . . . . .

رشحاتِ قلم:

۱۔	پیش لفظ	۷
۲۔	مائی	۹
۳۔	یہ دردِ بے نوا	۱۷
۴۔	رخسانہ	۲۳
۵۔	یاور	۲۸
۶۔	کشش	۳۷
۷۔	ہما	۴۶
۸۔	کوئل نے کوکنا بند کیا	۵۲

۹۔	شین آپا	۵۷
۱۰۔	انشاء	۶۷
۱۱۔	نصیب کور	۷۹
۱۲۔	فیصلہ ابھی باقی ہے	۸۷
۱۳۔	بھالو	۹۵
۱۴۔	کالی برف، کالا کبوتر اور سفید کوا	۱۰۲
۱۵۔	بارہ ٹیلے	۱۰۷
۱۶۔	معصوم	۱۱۵
۱۷۔	کتا	۱۲۱

پیش لفظ

''فیصلہ ابھی باقی ہے'' میں شامل اکثر افسانے میں نے ریاست کے سرحدی ضلع پونچھ میں لکھے ہیں جہاں میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ تقسیم ملک کے دوران تب کی ریاست پونچھ دو حصوں میں بٹ گئی۔ آدھے سے زیادہ اُس پار اور آدھے سے کم اِس پار اور اس طرح عوام کی اکائی دو پھاڑ ہو گئی۔ لوگ اپنے آبائی وطن، اپنا مال و جائداد، زمین زراعت چھوڑ کر ادھر اُدھر ہو کے رہ گئے۔ بستیاں اُجڑ گئیں اور بہت خون بہا۔ ان حالات کا ذکر بہت سے افسانوں اور مضامین میں متعدد قلمکاروں نے کیا ہے جن میں برصغیر کے مشہور قلمکار افسانہ نویس کرشن چندر سرفہرست ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر کے والد پونچھ کے مہاراجہ کے شاہی معالج تھے اور اس طرح کرشن چندر کا بچپن سے ہی پونچھ کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ اگرچہ ان کی پیدائش وزیر آباد (تب کے پنجاب) میں ہوئی تھی لیکن والد کے ساتھ رہ کر انہوں نے بہت سارا وقت پونچھ میں گزارا۔ ان کی کہانیاں شکست، مٹی کے صنم اور غدر ان کی اسی وابستگی کی عکاس ہیں۔ پونچھ میں اس وقت بھی کرشن چندر کے نام سے منسوب کرشن چندر پارک موجود ہے جسے انگریز زمانے میں فونٹین گارڈن FOUNTAIN GARDEN کہا جاتا تھا۔ میں اپنے قیام پونچھ کے دوران اسی پارک میں جا کر وہاں کرشن چندر کی یاد

میں نصب کتبہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ کرشن چندر کے افسانے صنم کی مٹی میں جن جذبات کا احساس موجود ہے اسی نے مجھے تقسیم ملک سے وابستہ افسانے لکھنے کی ترغیب دی۔ صنم کی مٹی سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے

" حاجی پیر تو سرور خان کا ہے۔ احمد خان کا ہے، غلام رسول کا ہے، کرشن چندر کا ہے، جنہوں نے حاجی پیر سے مزار کی مٹی چاٹی ہے۔ اس کے پیڑ کے ننگی، سوکھی اور بے پھول شاخوں کے غم دیکھے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ سیکورٹی کونسل کا ایک اجلاس حاجی پیر پر بُلایا جائے اور اُس کے استقبال کے لئے سرور خان کا پھٹا ہوا کوٹ جس میں غریبی کی گولیوں نے سوراخ کر دئے ہیں، یو این او کے جھنڈے کی طرح ٹانگ دیا جائے اور پھر پوچھوں کہ بتاؤ حاجی پیر پر کیوں حق جتا رہے ہو"

ان افسانوں کو قلم بند کرنے کے دوران میری ملاقات اُن عمر رسیدہ لوگوں سے بھی ہوئی جو واقعاتِ تقسیم ملک کے چشم دید گواہ ہیں اور اُن سے بھی جن تک یہ سب کچھ بالواسطہ پہنچا ہے اور بعد میں خود اس کے نتائج سہے ہیں۔ عوم کی بیچارگی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا، جدائی کا غم اور پھر ہمت و حوصلہ اور سرابوں میں سر گرداں۔ یہی ہے یہ سب کہانی

میں نے افسانوں کی ترتیب گزرے ہوئے کل سے شروع کی ہے اور اسے آج تک لے آیا ہوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔

محمد شفیع ایاز

مائی

شہر کی سڑکیں دھوئی گئی تھیں، عمارتیں نہلائی گئی تھیں مرمتیں کی گئی تھیں اور دیواروں کو رنگ وروغن سے سجایا گیا تھا۔ گویا شہر کو دُلہن کی طرح سنوارا گیا تھا۔ سڑکوں کے بیچوں بیچ تقسیم کرنے والے بائی سیکٹر لگائے گئے تھے اور دوطرفہ ٹریفک کو یقینی بنا کر ٹریفک جام نہ ہونے کی کوشش جاری تھیں ٹریفک حکام ڈرائیوروں کو من مانی طریقے سے گاڑیاں چلانے کیلئے آج اپنا جیب گرم نہیں کر رہے تھے بلکہ آج اُن کے دونوں ہاتھ ٹریفک کی نقل وحرکت کو کنٹرول کرنے میں مصروف تھے ۔ سارے سرکاری حکام چاک و چوبند تھے۔ پٹریوں پر کوئی دکان سجی نہیں تھی اور نہ ریڑے والے کہیں نظر آرہے تھے۔ آج شہر کا منظر دِلکش ، دلفریب اور قابلِ دید تھا۔ کہیں کوئی بھکاری بھی نظر نہیں آرہا تھا مگر ''مائی'' وہ تو بے جھجک، سب سے لاتعلق ہو کر سڑک پر چل رہی تھی۔ کچھ پولیس والوں نے اُسے دُور ہٹنے کو کہا بھی لیکن وہ

کہاں مانتی۔'

'مائی'' ادھیڑ عمر کی ایک عورت تھی جو اس شہر میں پچھلے دو دہائیوں سے ایسے ہی سڑکوں پر گھوما کرتی تھی۔ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے، یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ دکانداروں سے روٹی مانگ کر کھاتی اور رات کسی دکان کے پاس، پٹری پر یا بس سٹینڈ پر گذارتی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، چٹے سفید بکھرے بالوں والی ''مائی'' کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا اور وہ ہمیشہ زور زور سے چلاتی رہتی تھی۔ ''بھاگو بھاگو۔ ابھی گولیاں چلیں گی، گولے برسیں گے.... دیکھو کتنے لوگوں کو مارا ہے، کتنوں کی گردنیں کاٹی گئیں ہیں۔ وہ دیکھو اسکے ہاتھ پاؤں باندھے ہیں اور اسے گھسیٹ کر لے جارہے ہیں۔ اُسے کوئی بچاؤ۔ ہر طرف آگ لگی ہے۔ سبھی جھلس جائینگے۔ ساری بستی اُجڑنے والی ہے۔ بھاگو بھاگو''۔ وہ کیا کہہ رہی تھی سبھی جانتے ہوئے بھی جیسے نہ سمجھنے کی اداکاری کر رہے تھے۔

بازار کے دکاندار، بستی کے سارے لوگ، بس اڈے پر آنے جانے والے مسافر سب اسکو ''مائی'' کہتے تھے۔ نہ کسی کی بات کا جواب دینا اور نہ کسی سے کوئی بات کرنا۔ بس سڑک پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر لگانا اور چلانا.... یہی اسکا معمول تھا۔ آج ''مائی'' ذرا تیز آواز میں چلا رہی تھی اور پولیس والے اُسے مین روڈ سے دور لے جارہے تھے۔

اسی دوران سائیرن کی آواز سنائی دی اور سب پولیس والے الرٹ ہوکر سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوگئے۔ گاڑیوں کا ایک کارواں سڑک سے گذرنے لگا۔ آگے آگے سیکورٹی کی گاڑیاں بیچ میں ملکی سربراہ اور پیچھے پیچھے تمام سرکاری افسروں کی گاڑیاں اور انکے پیچھے گاڑیوں میں مقامی سیاسی لیڈر، بارسوُخ لوگ اور قصیدہ گو.....

کاروان گذرنے کے چند ہی گھنٹوں بعد شہر پھر اپنی ہئیت میں واپس آگیا۔ وردی پوش غائب اور سفید پوش نمودار ہوئے لیکن ''مائی'' کہیں نظر نہیں آئی ۔ دن ڈھل گیا، شام ہوگئی ، بازار بند ہوگیا، سڑکیں سنسان ہوگئیں ۔اور پھر ایک نئی صبح کا آغاز ۔ وہی بازار، وہی لوگ ، وہی ہلچل، وہی ٹریفک جام، شوروغل، ٹریفک والوں کا ہاتھ جیب میں، سب کچھ حسبِ قدیم مگر ''مائی'' اسکا پتہ نہیں ۔ ''مائی'' اکثر ایک حلوائی کے دکان کے پاس کھڑی رہتی ۔ وہ بھی مائی کو نہ دیکھکر متفکر ہوا اور ہمسایہ دکاندار سے پُوچھا

''عبداللہ چاچا۔ ''مائی'' آج نظر نہیں آتی ۔تم نے اُسے کہیں دیکھا؟'' ''نہیں.....میں نے بھی آج اُسے نہیں دیکھا۔لیکن ہاں کل صبح چند پولیس والے اسکو مین روڈ سے دور لے جاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا اور اسکے بعد کا مجھے پتہ نہیں۔'' عبداللہ چاچا نے حلوائی سے کہا

''کہیں پولیس والے اسکو تھانے تو نہیں لے گئے ۔ جب بھی کوئی

بڑا لیڈر یا حاکم آتا ہے تو عزیبوں کی شامت آجاتی ہے'' حلوائی کہہ رہا تھا۔

''تھانے.... نہیں ایسا نہیں۔ میرا بھتیجا تو اِسی تھانے میں ڈیوٹی پر ہے۔ وہ مائی کو جانتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا وہ ضرور گھر میں بتاتا۔'' عبداللہ چاچا نے جواب دیا۔

شام ہوتے ہوتے بازار کے سب دکانداروں کو ''مائی'' کی فکر ہونے لگی۔ کیونکہ وہ سب کی ''مائی'' تھی، کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا سکھ کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا غریب کیا امیر، سب کے پاس جاتی، سب کے ہاتھ سے روٹی کھاتی۔ لہذا سبھی مائی کے بارے میں فکر مند تھے۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی کہ راموآیا۔ راموا اس بستی کا چلتا پھرتا اخبار تھا۔ ہر چیز کی خبر رکھتا تھا اور اسکی خبر صد فیصد درست ہوتی تھی۔

''رامو۔ کل سے مائی کہیں نظر نہیں آتی۔ تمہیں کچھ خبر ہے؟''

ایک دکاندار نے راموسے پوچھا

''اُسے تو کل پولیس والے گھسیٹ کر ''سوکھا کٹھا'' لے گئے تھے اور وہی چھوڑ آئے تھے۔ بعد میں کسی نے وہاں اسکو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا اور اُسے ہسپتال لے گیا۔ وہ تو کل شام سے ہسپتال میں بھرتی ہے'' راموں نے مائی کی خبر سنادی۔

یہ سُن کر پانچ آٹھ دکاندار ہسپتال چلے گئے۔ دیکھا کہ ''مائی''

بیڈ پر بیہوشی کی حالت میں پڑی ہے۔ اُسے آکسیجن لگایا جارہا تھا۔ جسم پر کوئی چوٹ وغیرہ نہیں تھی لیکن ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ذہنی مریض ہے کوئی صدمہ پیش آیا ہے ورنہ ظاہری طور کوئی بیماری نہیں۔ کوئی پرانی بیماری ہوسکتی جواب لاعلاج ہوگئی ہے۔ سانس لینے میں دشواری ہورہی ہے اور حالت نازک ہے۔

عبداللہ چاچا۔ جو قریباً ''مائی'' کی عمر کا ہی تھا، مائی کے قریب گیا اور اسکے ہاتھ بازو اٹھانے لگا اور پھر اک دم رُک گیا.....وہ سب کی طرف حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا اور بولا

''ارے دیکھو۔ اتنے برسوں سے ہم مائی کو دیکھتے آرہے ہیں اور کبھی بھی ہماری نظر اسکے بائیں بازو پر کندہ الفاظ پر نہیں پڑی جو میل میں صاف دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ''لاجونتی کشپ''.....یہ تو ہمارے شہر کے بیوپار منڈل کے صدر راجو کشپ کی ماں کا نام تھا جو تقسیم ملک کے دوران فساد میں اپنے خاوند رام جی کشپ کے ساتھ ماری گئی تھی اور ان دونوں کی لاشیں بھی نہیں ملی تھیں۔ یہی سُنا تھا تب ہم نے''

وہاں پر موجود سب لوگ عبداللہ چاچا کی یہ بات سُن کر ششدر ہوکر رہ گئے۔ راجو کشپ کی ماں.....لاجونتی کشپ۔ سب کی زبان پر یہی تھا تقسیم ملک کے دوران اس سرحدی علاقے کے لوگوں پر ایک قیامت برپا

ہوئی تھی۔لڑائی اور فساد میں بستیاں اُجڑ گئیں، گھر جل گئے، کتنے ہی لوگ بے گھر ہوئے، کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں، کتنے بچے یتیم ہوگئے اور کتنوں نے اپنی جانیں گنوادی۔رام جی کشپ شہر کے اُس علاقے میں رہتا تھا جو تقسیم ملک کے بعد سرحد کے اُس طرف ہوگیا۔دنگوں میں اسکی پوری جائیداد گھر، دکان سب کچھ ختم ہوگیا اور وہ اپنی بیوی لاجونتی اور آٹھ دس سال کی عمر کے دو بیٹوں راجو اور رانو کو ساتھ لے کر وہاں سے بھاگ گیا۔رستے میں بلوائیوں نے اُسے پکڑ لیا۔راجو اور رانو کو چھوڑ دیا اور وہ بھاگتے بھاگتے اِس طرف آگئے اور یہاں پر ایک انسان دوست شخص عزیز میاں نے انکو اپنے گھر میں پناہ دی۔لڑائی تھم گئی، دھندے رُک گئے۔معلوم ہوا کہ رام جی کشپ اور اسکی بیوی دھنگوں میں مارے گئے ہیں اور ان کی لاشوں کا کچھ بھی پتہ نہ چلا۔راجو اور رامو کو بعد میں ایک مقامی شخص کپُور نے گود لیا۔کپور کی کوئی اولاد نہیں تھی۔اُسنے ان دونوں کو اچھی طرح پڑھایا لکھایا۔وہ خود ایک دکان چلاتا تھا اسکے مرنے کے بعد یہ دونوں بھائی اسکی جائیداد کے وارث ہوگئے۔رامو نے کاروبار سنبھالا اور محنت اور دیانتداری سے اپنے کاروبار کو وسیع کر دیا اور کاروباری حلقوں میں ایک مقام اور نام پایا جبھی وہ بیوپار منڈل کا صدر بنا۔رانا بیرون ریاست ایک مشہور کمپنی میں اچھی خاصی سروس کر رہا تھا اور بہت اچھی طرح اپنی زندگی گزار رہا تھا۔دونوں کی شادی ہوگئی، بال بچے

ہو گئے جواب اچھے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

مائی کی اصلیت جب ظاہر ہوئی تو یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجو کشپ دوڑتے دوڑتے ہسپتال پہنچا اور ماں کے قدموں کو چومنے لگا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہنے لگا۔

''مائی۔ میری ماں۔ میری دکان پر بھیک مانگنے آتی تھی۔ اتنے برسوں سے اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ میری ماں ہے.....''

''راجو بیٹا..... یہ رونے کا وقت نہیں۔ ہمت جِٹانے کا وقت ہے اپنی ماں کو کسی اچھے ہسپتال میں لے چلو جہاں اسکا اچھا علاج ہوگا۔ خدا نے تمہیں ایک موقعہ دیا ہے ماں کی خدمت کرنے کا.....'' عبداللہ چاچا راجو کو ہمت اور دلاسہ دے رہا تھا۔

راجو نے اپنے بھائی رامو کو بھی فون پر مطلع کیا اور وہ دوسرے ہی دن آ پہنچا۔ دونوں بھائی اپنی ماں کی ایک بات سُننے کیلئے ترستے تھے۔ ماں جسنے انہیں جنم دیا تھا۔ پچھلے بیس سال سے ہماری ماں ہمارے سامنے بھیک مانگتی رہی، روٹی کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلتی رہی، گلی گلی سڑکوں پر رات گزارتی رہی اور ہم بے خبر رہے۔ اس نے بیس سال کہاں گزارے، کیسے پھر اس شہر میں آئی''..... دونوں بیٹے اپنے آپ کو کوس رہے تھے اور اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہم اسے ملک کے سب سے بڑے ہسپتال میں لیجائینگے۔ڈاکٹر صاحب آپ صرف ہمیں اُس ہسپتال کا نام بتادیں جہاں ہماری ماں کا اچھا علاج ہوسکتا ہے جہاں ہماری ماں ٹھیک ہوسکتی ہے۔ جتنے بھی پیسے خرچ ہونگے اسکی کوئی فکر نہیں.....ہمیں صرف ہماری ماں چاہئے'' دونوں راجو اور راموڈاکٹر سے کہہ رہے تھے۔

ابھی ڈاکٹر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مائی نے زبان کو تھوڑی حرکت دی ایک لمحے کیلئے آنکھیں کھولیں اور پھر چلائی لیکن ذرا دھیمے لہجے میں ''بھاگو بھاگو.....میں بھی بھاگ رہی ہوں....'' اور پھر سدا کے لئے خاموش ہوگئی

☆☆☆

یہ دردِ بے نوا

اپریل کا مہینہ تھا چمکتی ہوئی نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نئے نئے پھُولوں اور کلیوں کے رنگ بڑے گہرے تھے۔ ہر طرف اتنے پھول اور سبزہ تھا کہ جہاں تک نگاہ جاتی تھی رنگ ہی رنگ نظر آرہے تھے.....اور گہرا آسمان جھکا ہوا تھا۔ اس جگہ کو لوگ ''مرگ'' کہتے ہیں۔ اس میں مٹی پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے چند چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے جنہیں ''ڈھوکہ'' کہا جاتا ہے۔ ان میں کچھ لوگ رہ رہے ہیں۔ یہ لوگ گرمیوں میں اِن ڈھوکوں میں آتے ہیں اور بھینس بکریاں پالتے ہیں اور گرمیوں میں شہروں یا قصبوں میں جا کر مزدوری کرتے ہیں۔

اشرف بھی اک ڈھوکے میں اپنے بوڑھے ماں باپ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اسکے ضعیف العُمر والدین کی تھکی ہوئی بوڑھی آنکھوں میں حسرتیں ہی حسرتیں تھیں، اشرف سر جھکائے۔ چہرے پر زمانے بھر کی فکر لئے ہوئے آیا۔ پھٹی پرانی چپل اور گرد آلود پیر۔ چولہے کے نزدیک سولہ سترہ برس کی دو بہنیں چھینٹ کی معمولی شلوار قمیضوں میں ڈھکے چھپے سروں پر

عام سے دوپٹے اوڑھے آنکھوں میں اُمیدوں کے چراغ جلائے بیٹھی ہیں۔

''بھائی کے لئے روٹی لاؤ....'' ماں نے بیٹیوں سے کہا اور اشرف سے مخاطب ہوئی ''

''بیٹا کیا ہوا تیری نوکری کا.....''

لیکن اشرف نے کوئی جواب نہیں دیا

''بیٹے اشرف۔ تیری اماں تجھ سے کچھ پوچھ رہی ہے۔'' بابا نے پوچھا

''میں ..... بابا میں ہار چکا ہوں بابا.....'' اشرف کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''کیا ہوا بیٹے.... ذرا میں بھی سنو''

اشرف خاموش رہا جیسے اُسکے ہونٹوں پر مہر لگی تھی وہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اشرف کا باپ چراغ الدین اپنی جوانی کے دنوں مزدوری کیا کرتا تھا۔ گھر میں تھوڑی زمین تھی جس پر مکی کی فصل اُگتی تھی اور دو چار مہینے ہی اُس پر گزارا ہوتا تھا۔ شادی بھی قدرے دیر سے کی۔ ایک بیٹا اور دو بیٹاں پیدا ہوئیں۔ زندگی کی گاڑی چلانا اُسکے لئے آسان نہ تھا۔ کبھی کبھی کئی روز تک کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ بھینس کا دودھ بیچ کر، مکی کی سوکھی روٹی، لسی اور چٹنی کھانے میں ملتی تھی۔ چراغ الدین کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ بال بچوں کو اچھی طرح پال نہیں سکتا مگر کرتا بھی کیا۔ کبھی حالات، کبھی قسمت

اور کبھی زمانے کو کوسنا۔ ان مشکل حالات میں بھی اس نے اپنے بیٹے اشرف کو بارہویں جماعت تک پڑھایا۔ اگرچہ پڑھائی کیلئے اسے اپنے گھر سے بہت دور جانا پڑتا تھا لیکن اسکے باپ کی چاہت تھی اشرف پڑھے۔ جبھی چراغ الدین نے اشرف کو اسی سکول کے ایک ماسٹر کے گھر میں رکھا۔ ماسٹر نے چراغ الدین کو بتایا تھا کہ اشرف اسکے گھر میں کام کاج میں تھوڑا سا ہاتھ بٹائے باقی وہ اپنی پڑھائی کرے۔ کھانا پینا اور رہنا اُسکے ذمہ۔ اشرف ماسٹر کے ہاں رہنے لگے اور پھر وہاں کیا ہوا اُسے چراغ الدین بھی ناواقف رہا۔ اشرف کو ماسٹر نے باضابطہ گھر کا نوکر بنا کے رکھ دیا۔ صبح سویرے اٹھ کر روٹی بنانا، پورے گھر اور آنگن کی صفائی، ان حالات میں کبھی سکول جانا اور کبھی گاؤں کی زمین پر مزدوری کرنا۔ چار بجے کے بعد روٹی، سبزی بنانا، چائے تیار کرنا، برتن دھونا، کپڑے دھونا یہ اسکا معمول تھا۔ اسکے علاوہ ماسٹر کے بچوں کو صبح سکول چھوڑنا، دوپہر واپس لانا۔ چھٹی یا اتوار کے دن کھیت پر کام کرنا۔ اسکی کیا مجال تھی کہ کبھی ماسٹر یا اسکی بیوی سے آنکھ ملائے یا بات کرے جیسا بندھوا مزدور.... وہ شریف تو تھا ہی کم گو بھی تھا حد یہ کہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اب وہ بزدل بھی بن گیا تھا۔ اشرف کب پڑھتا تھا یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کیونکہ پورے دن وہ کام کاج میں مصروف رہتا۔ آخر اُسنے دو سال ایسے ہی گزار دے۔ امتحان دیدیا اور بارہویں کا امتحان پاس کیا۔

چراغ الدین اپنے بیٹے کی کامیابی کی خبر سُنکر اتنا خوش ہوا جیسے اُسے زمانے بھر کی ساری خوشیاں مل گئی ہوں۔ اب اُس کی سکت نہیں تھی اور نہ ہی اُتنے وسائل کہ وہ اشرف کو آگے پڑھا سکے۔ کالج کافی دور تھا اور.....ویسے بھی سرکاری ملازمت کے لئے بنیادی تعلیم بارہویں پاس ہی رکھی گئی ہے۔ سوچا سرکاری نوکری ملے تو سہارا بنے۔ دونوں بیٹیوں کو چراغ الدین نے الف بے سے ناواقف ہی رکھا وجہ بس پڑھائی کا خرچہ.....ایک اور وجہ تھی کہ اس مرگ کی کوئی لڑکی سکول نہیں جاتی تھی۔ گھر کا ہی کام کرتی تھی۔

اب بارہویں پاس ہوئے بھی اشرف کو تین سال ہوئے تھے۔ جہاں کوئی بھی نوکری کا اشتہار نکلتا وہ فارم بھرنے جاتا۔ کتنے ہی انٹرویو دیئے، کتنے دفتروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ کتنی خاک چھانی۔ کبھی رہبر تعلیم کے انٹرویو، کبھی پولیس کی بھرتی، کبھی فوج میں بھرتی۔۔۔۔اور آج علی الصبح وہ نماز پڑھ کر اسی اُمید پہ گھر سے نکلا تھا چونکہ اس بار اُسنے تحریری امتحان امتیازی پوزیشن میں پاس کیا تھا اور انٹرویو بھی اچھی طرح دیا تھا۔ اپنے گاؤں (مرگ) کا واحد امیدوار تھا، اُمید تھی اُسے نوکری مل ہی جائیگی۔ آج لسٹ نکلنے والی تھی وہ خوش تھا کہ اسکا نام لسٹ میں ہوگا۔ لیکن۔۔۔۔لسٹ.....لسٹ نکل چکی تھی ایک روز پہلے ہی اور اسمیں اُسکا نام نہیں تھا۔ دس منتخب ناموں میں اسکا نام کہیں نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر جیسے اُس کا دم گھٹنے لگا۔ ساری

امیدیں ٹوٹ گئیں۔

''کیا مجھے اسے اپنی بدنصیبی سمجھ کر قبول کرنا چاہئے۔ آخر یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بوڑھے ماں باپ، جوان بہنیں۔ کیا بابا کی تھکن دور نہیں ہوگی، کیا بہنوں کے ہاتھ پیلے نہیں ہونگے۔ پیٹ کی آگ بجھانا بھی مشکل ہے۔ کب تک اپنے اور اپنے گھر والوں کو تسلّی دیتا رہونگا۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں میری قسمت میں وقت کی ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس کوئی وسیلہ نہیں، نہ رشوت دینے کیلئے پیسہ، نہ کسی سیاستدان یا سرکاری آفسر کا رشتہ دار اور نہ ان طبقوں سے تعلق رکھتا ہوں جنہیں سرکار نے مخصوص زمرے میں رکھا ہے۔ ہم غریب ہیں، مفلس ہیں، نادار ہیں لیکن ہماری ذات مخصوص زمروں والی نہیں۔ گندی سوچ رکھنے والوں کی گندہ پالیساں.....ہم جیسے مفلسوں کیلئے کچھ نہیں.....'' یہی سوچ کر اشرف آج گھر لوٹا تھا۔

''یہ لو بھیا... مکی کی خشک روٹی، تھوڑی چٹنی ہے۔ ہاتھ صاف کرونا بھیا''

''اشرف بیٹا روٹی کھالو'' بابا نے بھی کہا

لیکن اشرف پتھر کے مجسمے کی طرح چپ چاپ تھا۔

''میری بات سُن لے بیٹا.... آج نہیں تو کل تمہیں نوکری مل ہی

جائیگی۔ میں کونسا پڑھا لکھا تھا میں نے کون سی نوکری کی لیکن زندگی کی گاڑی چلتی رہی، گھر چلتا رہا۔ گھی والی روٹی نہ سہی خشک روٹی تو ملی۔ جو مقدر میں ہے وہ چلتا رہا۔ اب روٹی کھالے اور سو جا۔ دیر ہوگئی ہے۔'' بابا بیٹے کو دلاسہ دے رہا تھا۔

اشرف کو معلوم تھا کہ بابا اسے دلاسہ دے رہا ہے لیکن اسکی باتوں میں بھی اک درد چھپا ہوا ہے۔ اماں خاموش بیٹھی اور دو بہنیں۔ وہ مایوس اور اداس۔

رات ہوگئی سب سو گئے۔ سحری کے وقت اشرف منہ ہاتھ دھونے ڈھوکے سے باہر نکلا۔ جاتے وقت بہن سے کوئی کپڑا مانگا۔ مگر اُسنے نہیں دیا۔ چائے بھی تیار ہوئی۔ لیکن اشرف ابھی تک باہر سے نہیں آیا۔ اِسی دوران باہر سے کچھ شور سنائی دیا..... چراغ دین باہر نکلا تو دیکھا کچھ بکروال ڈھوکے کی جانب کاندھے پر چارپائی لا رہے تھے۔ نزدیک پہنچے،، چارپائی نیچے رکھی.. اشرف کا معصوم چہرہ سامنے تھا۔ ماں، دو بہنیں چیختی پکارتی، سینہ کوبی کرنے لگیں۔ تیز ہوا چلنے لگی اور اشرف کی بڑی بہن ہاجرہ کے سر سے دوپٹہ ہوا نے اڑا لیا اور اشرف کے چہرے پر ڈال دیا۔ ☆☆

رُخسانہ

لال پیلے فینسی سوٹ میں موجود لڑکیوں میں وہ سب سے علیحدہ اور نمایاں تھی۔ لمبے گھنے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سادگی میں بھی رعنائی سے بھرپور تھا۔ کانوں میں رِنگ تھے اور گردن میں سفید موتیوں کی اک مالا تھی۔ بائیں ہاتھ میں گھڑی اور دائیں ہاتھ میں بریسلیٹ ۔اس کے چہرے پر بے نیازی اور سنجیدگی تھی جو کسی کو اس سے بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیتی تھی۔ پرویز اُسے دیکھکر سب کچھ بھُول گیا۔ وہ صرف اور صرف اُس حسین پری کو تکتا رہا۔

''پرویز اس گاؤں میں چھ ماہ پہلے بسلسلہ ملازمت آیا تھا۔ گاؤں میں دن گزارنا وہ قیامت سے کم نہیں سمجھتا۔ شہری ماحول میں پالا پوسا ہُوا نوجوان، گاؤں میں گھُٹن محسوس کر رہا تھا۔ آج اسکے ایک ماتحت ملازم راشد کی بہن کی شادی کے موقعہ پر وہ دعوت میں شامل تھا۔ شادی کی اس رنگا رنگ تقریب میں جب اسکی نظریں ایک حسین لڑکی پر پڑیں تو ایکدم اسکے ہُوش اڑ گئے۔

''گاؤں میں اتنی خوبصورت لڑکی۔'' پرویز دل ہی دل میں سوچ

رہا تھا۔ دُلہا آیا براتیوں کا سواگت کیا گیا اور رخصتی بھی ہوگئی مگر پرویز.....وہ ابھی وہیں پر رہا۔ اُس حسین دلرُبا کی تلاش میں۔

اس واقعہ نے پرویز کے خیالات اور اسکی سوچ بدل دی۔ اُسنے گاؤں میں ایک کمرہ کرایہ پہ لیا۔ اب وہ دفتری اوقات کے بعد راشد کے ساتھ اسکے گھر جاتا رہا اور دونوں وہاں پہروں بیٹھتے اور باتیں کرتے۔

ایکدن وہی حسین لڑکی راشد کے گھر آگئی۔ پرویز نے جونہی اُسے دیکھا تو یقین نہیں آیا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ راشد نے کہا۔

''پرویز صاحب۔ یہ میری بہن کی سہیلی ہے رخسانہ۔ ہمارے پڑوس میں ہی رہتی ہے اور گاؤں کی پہلی بے اے پاس لڑکی ہے''۔

پرویز نے غور سے رخسانہ دیکھا۔

''ہاں رخسانہ۔ یہ میرے صاحب ہیں، پرویز صاحب۔ شہر کے رہنے والے ہیں رخسانہ نے پرویز کو سلام کیا اور اندر چلی گئی۔

کچھ منٹوں کے بعد راشد کی بہن کے ساتھ رخسانہ چائے لیکر آئی اور پرویز کے سامنے رکھی۔

''صاحب۔ چائے پیجئے۔''

پرویز نے مسکان بھرے انداز میں کہا

''میں کوئی صاحب نہیں۔صرف پرویز ہوں۔''

اب پرویز نت نئے بہانے بنا کر ہفتے میں دو تین بار رخسانہ سے ملتا اور ایک سکون سا محسوس کرتا۔ دن گزرتے گئے اور پرویز کے دل میں محبت کی چنگاری نے ایک شعلہ بھڑکایا۔ وہ دن رات رخسانہ کے متعلق سوچتا رہا۔ راتوں کی نیند بھی گئی۔ دن کا چین نہ رہا۔ اسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا مگر.....مگر احساس شرم کا مارا پرویز۔شاید اس آگ کی تپش کا احساس رخسانہ کو بھی ہوا اور وہ بھی اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اور پرویز گاؤں میں محکمہ زراعت کی طرف سے دئے گئے اُدھاری کھاد کی قیمت کی وصولیابی کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ کچھ گاؤں والوں نے ابھی ادھار پر لی گئی کھاد کی قیمت جمع نہیں کی تھی۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا دن بھر کی مشغولیات کے بعد اپنی کرسی پر آرام کر رہا تھا۔ کہ آہستہ سے دروازہ کھُل گیا اور کسی نے پردہ اٹھایا۔ جونہی پرویز کی نظر رخسانہ پر پڑی اسکے جسم میں جیسے بجلی کی رو دوڑ گئی۔ رخسانہ کے چہرے پر سرخی تھی، آنکھیں نم تھیں اور وہ سہمی سہمی سی تھی۔

''پرویز صاحب۔ میرے والد رمضان خان نے اُدھار پر یہاں سے کھاد لی ہے مگر بدقسمتی سے وہ بیماری میں مبتلا ہوا جس پر کافی خرچہ ہوا۔ جو دھان اُگایا وہ بیچ کر بھی دوائی کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ اب ان حالات میں وہ

قرضہ ادا کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔اب آپ ہی کچھ مہربانی کیجئے اور ہمیں دوسرے سال تک مہلت دیجئے۔ بڑی مہربانی ہوگی بڑا احسان ہوگا۔'' یہ کہکر رخسانہ خاموش ہوگئی

''رخسانہ۔پہلے تم کرسی پر بیٹھو۔'' پرویز نے کہا۔اور وہ بیٹھ گئی

پرویز سب کچھ بھول کر خوش تھا جیسے وقت نے ساری خوشیاں اسکے دامن میں ڈالدی تھیں ''رخسانہ۔تم فکر نہ کرو۔تم جیسا چاہتی ہو ایسا ہی ہوگا'' پرویز کے یہ الفاظ سنکر رخسانہ کھڑی ہوئی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے پرویز کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دفتر سے چل پڑی اور پرویز بھی اسکے ساتھ باہری دروازے تک آ گیا۔

اب دونوں ایکدوسرے سے بے تکلف کبھی کبھی ملتے رہے۔ پرویز نے حامی بھرلی کہ وہ رخسانہ کو اپنا جیون ساتھی بنائے گا۔اپنے گلستان میں وہ سدا خوبصورت پھول لگانا چاہتا تھا اور یہی تنہا اور آرزو لیکر اُس دن کے انتظار میں تھا جب وہ اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھے وقت گزرتے دیر نہیں لگتی اور آج۔۔۔۔۔پورے چھ ماہ بعد رخسانہ بن ٹھن کر پرویز سے ملنے آئی تھی۔موسم سہانا تھا اور بہار جوبن پر تھی۔ ہر طرف ہریالی اور خوشگوار ہوا۔

''پرویز۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے چاہتے ہو لیکن ہمارے بیچ ایک

ایسی دیوار حائل ہے جس کے سامنے ہم دونوں بے بس ہیں۔'' رخسانہ کے یہ الفاظ سنکر پرویز نے بھی جیسے اپنا دل کھول کے رکھ دیا

''رخسانہ۔تم نادان ہو۔ مجھے کسی دیوار کی کوئی پرواہ نہیں۔ مانا تم ایک غریب گھر کی بیٹی ہو اور میں امیر گھرانے کا افسر بیٹا۔مگر میں نے پہلے ہی اس دیوار کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے پہلے ہی اپنے گھر والوں کو اس بارے میں سب کچھ بتایا ہے اور وہ سبھی راضی بھی ہیں اور خوش بھی۔ انکی خوشیاں صرف میری خوشی سے ہے۔ مجھے صرف تمہارے ہاں کا انتظار ہے۔''

''مجھے افسوس ہے پرویز۔ مجھے غلط نہیں سمجھنا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میری شادی دو سال پہلے ہوئی ہے اور کچھ گھریلو تضاد کی بنا پر میں میکے میں تھی اور آج ۔۔۔آج میں واپس سسرال جا رہی ہوں ۔ میں تو صرف رخصت لینے آئی ہوں''۔وہ کہے جا رہی تھی اور ۔۔۔۔۔۔

کمرے میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔

☆☆☆

یاور

الیکشن لڑنے کا بھوت اس کے ذہن پر سوار تھا۔ لاکھ سمجھانے پر بھی یاور میری بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھا

''سیاست ایک گندا کھیل ہے۔ جو بھی اس میں گھس گیا گندگی ضرور لپٹ لے گی۔ ایکبار جو سیاست میں جو آ گیا پھر باہر نکلنا ناممکن ہے کیونکہ وہاں سے جو بھی دروازے کھلتے ہیں وہ سیاست کی ہی طرف جاتے ہیں۔ تیرا تو اپنا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ پڑھے لکھے ہو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے یا کونسی مجبوری ہے سیاست میں جانے اور الیکشن لڑنے کی.....''

''سیاست میں جانے یا الیکشن لڑنے کا فیصلہ میں نے اس لئے نہیں کیا کہ میں پیسے کماؤں یا سماج میں کوئی بڑا رتبہ ملے یا میرا اثر ورسوخ بڑھے۔ میرا واحد مقصد ہے عوامی خدمت۔ اُن لوگوں کی خدمت کرنا اور انکی آواز بننا جنکی کوئی سنتا نہیں، جنکی کوئی آواز نہیں۔۔ میں اُن کی آواز بننا چاہتا ہوں۔ جمہوریت ہی وہ طرزِ نظام ہے جس میں لوگوں کے منتخب نمائندے ہی حکومت بناتے ہیں اور فلاحی اور رفاعی کام کرتے ہیں۔ سڑکیں بنانا، پُل تعمیر کرنا، ہسپتالوں کا قیام، سکولوں کا کھولنا اور لوگوں کی جان اور مال کا تحفظ۔ یہ

تو سب سرکار کا ہی کام ہے اور میں اس نیک اور اچھے کام میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ اس میں کونسی خرابی ہے یا بُرائی ہے۔'' یاور جوشیلے انداز میں بتا رہا تھا۔

''یاور۔ میری بات ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سُن۔ یہ سڑکیں، یہ پل بنانا اور دیگر ترقیاتی کام صرف جمہوری نظام کی دین نہیں۔ جمہوریت کے بغیر بھی بادشاہ راجے اور حکمران یہ کام کرتے آئے ہیں اور آج سے بہتر طریقے سے۔ ابھی تک اُن کی بنائی ہوئی عمارتیں، محل، سڑکیں، پُل، باندھ، نہریں، باغات اور دیگر تعمیرات موجود ہیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ اچھی حالت میں ہیں یہ دوسری بات ہے کی آجکل عدم توجہ کے شکار ہیں۔ جبکہ جمہوری حکومت کے چند دہائیوں میں تعمیر ہوئی سڑکیں، پل یا عمارتیں مشکل سے دو تین سال ہی ٹکتی ہیں۔ تھوڑی سی بارش کیا ہوئی نہ کہیں سڑک، نہ پُل اور نہ باندھ۔ بلڈنگیں ویسے بھی خود ہی گرتی ہیں۔ پرانے زمانے میں نہ تربیت یافتہ انجینئر تھے، نہ اتنے وسائل، نہ تکنیک اور نہ نام نہاد ویجلنس اب بظاہر یہ سب چیزیں موجود ہیں مگر پھر بھی..... یہ سب رنگ لائی ہے ہماری یہ نام نہاد جمہوریت۔'' میں یاور کے سامنے حقائق لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب میری بات سُن۔ یہ بات میں بھی مانتا ہوں کہ موجودہ دور

میں کام وکاج کا معیار گر گیا ہے لیکن یہ جمہوری نظام کا قصور نہیں ۔ وہ لوگ ذمہ دار ہیں جو موٹی موٹی رقمیں رشوت کی صورت میں دیکر یا لے کر گھٹیا درجے یا غیر معیاری کام کرتے ہیں یا کراتے ہیں اور خزانہ عامرہ کو لوٹتے ہیں ۔ اس پر روک لگنی ہی چاہیے اور اس کے لئے صحیح افراد کا ارباب اقتدار میں ہونا ضروری ہے ۔ ارباب اقتدار کی صفوں میں شامل ہو کر ہی اِن بدعات کو روکا جاسکتا ہے اور جمہوریت ایک واحد راستہ ہے اس میں شامل ہونے کا۔ جبھی میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ ہمیں اپنا ذہن بدلنا ہوگا۔ سوچ بدلنی ہوگی۔ غلامی کے دور میں حکمرانوں نے اس لئے پولیس کی تشکیل کی تھی کہ وہ لوگوں کو دبائے ، انکی آواز دبائے تا کہ حکمران مطلق العنانی سے حکومت چلا سکیں ۔ غلامی ختم ہوگئی لیکن پولیس ۔۔ اس کا رُول اور کام کرنے کا ڈھنگ وہی ہے۔ انگریز چلے گئے لیکن ہمارے حکمران ابھی اُسی سوچ کو ساتھ لیکر کام کرتے ہیں ۔ کسی نہ کسی کو آگے آنا ہے جبھی سب کچھ ٹھیک ہوگا۔ ورنہ ہم صرف باتیں کرتے رہینگے ۔ میری تو دلی تمنا ہے کہ میں ایک صاف ستھرا اور دیانتدارانہ نظام قائم کرنے کیلئے کام کروں تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں ہمارا مذاق نہ اڑائیں''۔

یاور نے مصمم ارادہ کرلیا تھا سیاست میں کودنے کا اور الیکشن لڑنے کا۔ سوئے ہوئے آدمی کو جگایا جاسکتا ہے۔ کسی نے جاگے ہوئے ہی آنکھیں

بند کی ہوں اُسکی آنکھیں کھولنا ناممکن ہے۔ نہ معلوم اسکے دماغ میں یہ بات کیسے سوجھی، کیا کسی نے صلاح دی یا خود اپنی سوچ ہے۔

یاور سکول سے لیکر کالج تک میرا ہم جماعتی تھا۔ اگرچہ ہم گہرے دوست نہیں تھے مگر کلاس فیلو تھے اور ایسے ہی تعلقات تھے۔ ہاں ایک ہی محلّہ میں رہتے تھے، پڑوسی تھے اسکی وجہ سے بھی کچھ قرابت تھی۔ یہ تو میرا ذاتی خیال تھا۔ یاور کا دوستی کے بارے میں کہنا تھا کہ دوستی وہ بنیادی رشتہ ہے جو ہر رشتے کے رُوپ میں ڈھلتا ہے۔ اگر ہماری دوستی ہے تو ہم میں ماں، بہن بھائی اور دوسرے رشتے موجود ہیں۔ یاور ابتدائی ایام سے شریف النفس، دیانتدار اور حوصلہ مند تھا۔ اسکے خیالات اور اسکی سوچ کے سب قائل تھے۔

الیکشن کا بگُل بج گیا۔ یاور نے الیکشن لڑنے کا فارم بھر دیا۔ دوران انتخابی مہم اُسنے کافی محنت کی۔ ایک سیاسی پارٹی کی ٹکٹ اسکو مِل گئی۔ ایک مہینے تک اس نے دن رات مہم چلائی۔ گھر گھر، محلے محلے گیا۔ بہت سارے لوگ اسکو جانتے تھے اور اسے بھروسہ مند اور صحیح امیدوار گردانتے تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ محنت کے ساتھ پیسہ بھی خرچ ہوا۔ میں نے بھی یاور کو ہی اپنا ووٹ دیا۔ ووٹنگ مکمل ہوئی، چار دن بعد ووٹ شماری اور نتیجہ حسب توقع آ گیا۔۔۔ یاور جیت گیا، اُسے کامیابی ملی۔

سال، دو سال اور اب تین سال گزر گئے۔ اب وہ اپنے گھر کبھی

کبھار ہی آتا کیونکہ اُسے راجدھانی میں سرکاری کوٹھی ملی تھی اور وہیں رہنے لگا تھا۔ کبھی سرکاری ایوان میں شرکت، کبھی سرکاری میٹنگ اور دیگر تقریبات اُسے اب فرصت بہت کم ملتی ۔ مجھے بھی کبھی اسکی سرکاری کوٹھی پر جانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ ویسے سرکاری کوٹھیوں پر اکثر وہی لوگ جاتے ہیں جنکا کوئی کام ہوتا ہے اور میرا تو کوئی کام بھی نہیں تھا۔

چھٹی کا دن تھا اور میں گھر کے باہری دالان پر اخبار پڑھ رہا تھا کہ شریف چاچا نے باہری گیٹ کھولا اور اندر آیا۔ دیکھ کر میں ایکدم کھڑا ہو گیا۔

''چاچا جان۔ اسلام علیکم''۔

''وعلیکم اسلام ۔ بیٹے۔ کیا حال ہے۔ ٹھیک ہو؟'' شریف چاچا نے پوچھا

''شکر الحمدللہ ۔ آیئے چاچا جان ۔ اندر آیئے۔ اماں، شریف چاچا آئے ہیں'' میں نے آواز دی۔

اماں بھی باہر آ گئی اور ہم دونوں ماں بیٹے شریف چاچا کے ساتھ اندر داخل ہوئے شریف چاچا میرے مرحوم والد کے قریبی دوست تھے اور ان کے ساتھ اور انکے گھر کے ساتھ ہمارے قریبی تعلقات تھے۔ بچپن سے ہم انہیں چاچا کہہ کے پکارتے تھے اور سن بلوغ پر پہنچنے پر پتہ چلا وہ ہمارے سگے چاچا نہیں، والد صاحب کے دوست ہیں۔ ان کی شفقت ہمدردی اور

محبت۔سب میں وہ ہمارے سگے رشتے داروں سے بہتر تھے۔والد صاحب کی وفات پر وہ خوب روئے تھے۔دو دن تک کچھ کھایا بھی نہیں تھا....مجھے ابھی تک یاد ہے۔

''میرے یار۔۔مجھے چھوڑ کر کہاں گئے ۔ یہ دوستی کا اصول نہیں...'' والد صاحب کی قبر پر وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔جن لوگوں نے بھی انہیں اس روز قبرستان میں دیکھا وہ سب والد صاحب اور شریف چاچا کی دوستی کو لامثالی ماننے لگے۔والد صاحب کی وفات کے بعد بھی شریف چاچا خبر پرسی کیلئے ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔اب چونکہ پچھلے کچھ برسوں سے انکی طبیعت ناساز رہتی تھی لہذا اب اُن کا آنا جانا تھوڑا کم ہو گیا تھا۔آج ان کا ہمارے گھر آنا وہ بھی بڑی مدت کے بعد، غیر توقع تھا۔

حال چال پوچھنے اور چائے ناشتہ کرنے کے بعد شریف چاچا مجھ سے کہنے لگا ''بیٹا۔تمہیں معلوم ہے کہ اب میری طبیعت خراب ہے۔جب سے ملازمت سے ریٹائر ہو گیا تب سے طبیعت زیادہ ہی خراب ہونے لگی۔ ویسے عمر کا بھی یہ تقاضہ ہے۔آج میں تمہارے پاس ایک کام کیلئے آیا ہوں....''

''چاچا جان۔حکم کیجئے۔میں کونسی خدمت کر سکتا ہوں۔مجھے خوشی ہوگی'' میں نے کہا

''بیٹا۔ یاور صاحب تمہارا دوست ہے، واقف کار ہے۔ مجھے اُن کے پاس ایک کام ہے۔ اُس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے'' شریف چاچا نے کہا

''بھائی صاحب۔ کوئی بات نہیں۔ یاور اسکی کسی بھی بات کو نہیں ٹالے گا۔ منسٹر بننے سے پہلے تو اکثر اکٹھے ہی رہتے تھے۔ آپ بتائے کب جانا ہے آپ کے ساتھ جائیگا''۔ اماں بول اٹھی

''بھابی جان۔ آپکا بہت بہت شکریہ۔ مجھے یہی توقع تھی۔'' شریف چاچا بولے ''بیٹا۔ میری کھیتی کی زمین سرکار نے ایک سرکاری دفتر بنانے کیلیئے لی ہے اور مجھے جو معاوضے کی رقم دی جارہی ہے وہ بہت کم ہے۔ میرے پاس چار کنال زمین ہے چاروں میری ملکیت ہیں مگر پٹواری اور دیگر افسران مجھے صرف دو کنال کا معاوضہ دے رہے ہیں۔ جب میں نے تقاضہ کیا کہ چار کنال کے بجائے صرف دو کنال کا ہی معاوضہ کیوں تو اسی بات پر وہ راضی ہو گئے کہ اس شرط پر وہ پورے چار کنال کا معاوضے کے کاغذات بنائینگے کہ میں صرف تین کنال کے معاوضہ لینے پر رضامند ہو جاؤں۔ بصورت دیگر وہ کاغذات میں صرف دو کنال ہی دکھائینگے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میری اپنی زمین کا مجھے معاوضہ نہیں ملِ رہا ہے۔ اسی سلسلے میں یاور صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تا کہ مجھے میری زمین کا پورا معاوضہ

ملے۔'' شریف چاچا نے روداد سنائی۔

''چاچا جان۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ ظلم ہے۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہو جائے۔ ہم آج ہی یاور کے پاس جائینگے۔ وہ اُن کی خوب خبر لیگا۔ وہ تو رشوت کے نام سے ہی متنفر ہے۔ وہ انصاف کی آواز ہے اور اسکا مشن یہی ہے۔ اور ہاں چاچا جان فجر کے وقت مسجد میں کوئی بتا رہا تھا کہ آج وہ گھر آیا ہے۔ لہذا ہم وہیں جا کر اُن سے ملینگے۔''

بغیر دیر کئے شریف چاچا کو ساتھ لیکر میں یاور کے گھر پہنچا۔ وہاں پہلے ہی لوگوں کی خاص تعداد موجود تھی۔ پورا کمپونڈ لوگوں سے بھرا تھا۔ میں سیدھے گھر کے اندر داخل ہوا اور یاور کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر اُسنے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا

''بہت دیر کے بعد ملنا ہوا۔ آج کیسے آنا ہوا''

''اَب تو آپ کافی مشغول ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس بہت سارے کام ہیں۔ آج آپ کے پاس ایک کام ہے، آپکی مدد چاہیئے'' میں نے کہا'

'ویسے یہ بات صحیح ہے کہ اب میں کام کے ساتھ اتنا مصروف ہوتا ہے کہ فرصت نہیں ملتی آرام کی۔ آج آرام کرنے گھر آیا تھا لیکن یہاں بھی لوگ پہنچے ہیں۔ اچھا اب یہ بتاؤ کیا کام ہے؟'' یاور نے پوچھا

''یہ شریف چاچا ہیں۔ میرے والد کے قریبی دوست ۔ ان کی زمین کے معاوضے کا مسلہٗ ہے۔۔۔۔۔'' میں نے پوری بات سنادی۔

''اچھا۔ یہ معاملہ ہے۔ میری بات مان لو کہ پٹواری کے ساتھ بات کر کے مسلہٗ وہیں نمٹادو۔ تمہیں معلوم ہے کہ افسر شاہی اور سرکاری ملازموں کا طریقہ۔ سفید کو کالا اور کالے کو سفید بنانے میں انکا جواب نہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو مسلہٗ ایسے ہی لٹکتا رہیگا اور چاچا جان صرف دفتروں کی دھول چھانٹتا رہیگا او حاصل کچھ نہیں ہوگا۔''

یاور کی باتیں سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دوری پر بیٹھے شریف چاچا کو ساتھ چلنے کو کہا۔

'' ٹھہرو۔ ابھی چائے پی لو۔ چائے آرہی ہے۔ چائے پی کے جاؤ'' یاور نے روکتے ہوئے کہا اندر سے ایک آدمی چائے لیکر آیا۔ شریف چاچا اسکو دیکھ کر حیرانگی میں مجھ سے کہنے لگا ''بیٹا۔۔۔ یہی ہے وہ پٹواری جو .....''

☆☆☆

کشِش

دانش نے اپنے گاؤں کو برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ شہر کی رنگینوں اور دلچسپیوں نے اس کو کچھ ایسا اُلجھایا تھا کہ اس کو اپنے گاؤں کے نام سے بھی نفرت ہونے لگی تھی ۔ گاؤں کی کچی سڑکیں، کیچڑ بھری گلیاں، پرانے کچے غیر ترتیب مکان، ہر طرف مکھیاں اور مچھر، جگہ جگہ کوڑے کے انباروں اور وہاں کے رہنے والے لوگوں سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ گاؤں میں رہنے والے اسکے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹی بہن کس حال میں ہیں، کس طرح ان کی زندگی بسر ہوتی ہے وہ اس سے لاپرواہ تھا۔ وہ بنیادی طور بسلسلہ ملازمت اس شہر میں آیا تھا اور ایک کالج میں بحیثیت لیکچرار تعنیات ہوا تھا۔ دوسال بعد اس کا تبادلہ دوسرے ضلع کے ایک کالج میں ہُوا لیکن دوران ملازمت اُسنے اس شہر میں جو کمرہ کرایہ پر لیا تھا، وہ اسنے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ کبھی خالی نہیں کیا بلکہ لگا تار کرایہ دیتا رہا۔ کبھی کبھار اس کمرے کی صفائی کرنے کیلیئے آیا کرتا تھا۔ اگر چہ پچھلے بارہ سال میں اسکا تبادلہ مختلف کالجوں میں ہوا تھا لیکن کرایہ پر لیا ہوا کمرہ اُسنے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ دانش کی عمر

چالیس کو تجاوز کر چکی تھی اور بالوں میں ہلکی سی چاندنی بھی جھلک رہی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اسکے کپڑے پہننے کا انداز بھی نرالا تھا۔ کالی شرٹ، کالی پینٹ، آنکھوں پر کالی گاگل، سردیوں میں سر پر کالی ہیٹ..... ہر چیز عجیب مگر میچنگ۔ کسی سے زیادہ ملنا جُلنا نہیں۔ جب بھی کبھی کمرے میں آتا، خود چائے بنا کر پیتا اور روٹی باہر کسی ہوٹل میں کھا لیتا۔ اسکے کمرے میں ٹی وی تھا لیکن نہ کیبل کنکشن اور نہ سیٹ آف بکس۔ لہذا ٹی وی ہمیشہ بند ہی رہتا۔ ایک بیڈ، ایک کرسی اور ٹیبل۔ شیلف پر رکھے چند رسائل اور کتابیں۔ یہی اسکا سرمایہ تھا، اثاثہ تھا۔ کبھی بھی نماز پڑھتے یا مسجد جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی اسکو مذہب سے کوئی دلچسپی تھی۔ دانش کے بارے میں یہ سب جانکاری اسکے مالکِ مکان نے مجھے دی تھی جو میرا بھی لینڈ لارڈ تھا۔ میں اس شہر میں صرف تین ماہ پہلے آیا تھا جب میری پوسٹنگ یہاں ہوئی تھی۔ میرا کمرہ اس مکان کے دائیں طرف تھا اور بالکل اسکی مخالف سمت میں دانش کا کمرہ تھا۔ تین مہینوں میں وہ دو یا تین بار ہی میں نے اُسے اس کمرے میں آتے ہوئے دیکھا۔

اتوار تھی اور میں چھٹی کمرے میں ہی گذارنے کے موڈ میں تھا کیونکہ گرمی کا موسم تھا اور باہر دن کو بہت گرمی ہوتی تھی۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے دانش کو ورنڈا پر چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا۔ رات

کوگرچہ بہت بارش ہوئی تھی لیکن صبح ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔

''آداب پروفیسر صاحب'' میں دور سے ہی پروفیسر دانش سے مخاطب ہوا

''آداب....آپ کیسے ہو؟خیر سُکھ.....'' اسنے کہا

''شکر اللہ کا۔ابھی تک تو ٹھیک ہوں.....اور آپکا کیا حال ہے؟ آپ سے ملنے کی بہت چاہت تھی.....'' میں اسکے نزدیک جانے اور اُسے باتیں کرنے کی کوشش میں تھا۔

''جی میں ٹھیک ہوں'' اسنے جواب دیا

میں اس موقعہ کو ہاتھ جانے نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ لینڈ لارڈ سے دانش کے بارے میں سُن کر مجھے اس میں دلچسپی ہونے لگی تھی اور میں اُسے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔

''آیئے میرے روم میں.....چائے پیتے ہیں'' اسنے مجھے مدعو کیا

''پروفیسر صاحب۔تھوڑی دیر بعد آؤنگا''

جب میں پروفیسر دانشِ کے روم میں گیا تو وہاں وہی دیکھا جو لینڈ لارڈ نے بتایا تھا۔

آیئے آیئے خوش آمدید.....'' دانش کا چہرہ پہلی بار میں نے تھوڑا کھِلا ہوا دیکھا

''پروفیسر صاحب۔آپ آج کل کہاں ہوتے ہیں۔آپ گاہے گاہے ہی نظر آتے ہیں''میں نے پوچھا۔

''جناب۔اس وقت میری پوسٹنگ یہاں سے دور سو کلومیٹر ایک کالج میں ہے اور وہاں فلاسفی پڑھاتا ہوں۔وہاں سے روز اپ ڈاون کرنا ناممکن ہے۔اب جب بھی کبھی دو تین دن کی چھٹیاں ہوتی ہیں چلا آتا ہوں'' دانش نے جواب دیا

میں نے جسارت نہ کی کہ اسے میں یہ پوچھتا وہ چھٹیوں میں اپنے گھر کیوں نہیں جاتا اور یہاں بلاوجہ کمرہ کیوں لے رکھا ہے۔اسکا کیا فائدہ یا مطلب ہے۔چونکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور میں فی الحال اسکے نزدیک آنے کی کوشش میں تھا۔اِس ملاقات کے بعد پروفیسر دانش سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔جب بھی وہ آجاتا تو میرے ساتھ پہروں بیٹھا کرتا اور کبھی کبھار وہ مجھے ساتھ لیکر نزدیکی ہوٹل میں خود بھی کھاتا اور مجھے میں کھِلاتا۔ دن گزرتے گئے تعلقات بڑھتے گئے۔کھُل کر باتیں ہونے لگی۔ایکبار میں نے آخر اُس سے پُوچھ ہی لیا۔

''پروفیسر صاحب۔آپ کی زندگی کی داستان ایک بند مٹھی میں ہے اور یہ مٹھی خالی نہیں ہوسکتی۔''میں ابھی بات ہی کر رہا تھا کہ وہ بولنے لگا۔

''جناب۔بند مٹھی ہے لیکن۔یہ خالی ہے۔جو کچھ ہے وہ عیان

ہے۔ میں تو سیدھا سادا شخص ہُوں۔ مجھ میں کونسی ایسی بات ہے جو دلچسپ ہو اور کوئی اسمیں دلچسپی لینا کیوں چاہے؟'' پروفیسر دانش نے کہا۔

ہماری باتیں رات دیر گئے تک جاری رہیں اور اسنے بند مٹھی کھول ہی دی۔

''جناب۔ ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا ہوں۔ اکلوتا بیٹا ہوں اُنکا۔ گھر میں زمین زراعت رُب کا سب کچھ دیا ہوا ہے۔ بڑے شوق سے گھر والوں نے پڑھایا اور یونیورسٹی تک پہنچا۔ ایم اے کیا اور نوکری لگ گئی۔ پہلی پوسٹنگ اس شہر میں ہوئی۔ یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ جوانی کے دن تھا۔ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ اپنے برابر کسی کو نہیں مانتا۔ بس شہر آ گیا تو یہی رہنے لگا۔ چھ چھ ماہ تک گھر کا نام نہیں لیا۔ شہر کی زندگی میں رونق تھی، چہل پہل تھی، زندہ دلی تھی یہ سب کچھ میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے گاؤں سے ہی نفرت ہونے لگی۔ وہاں کی زمین خشک اور بے رحم لگنے لگی۔ لوگوں کے دل ودماغ ..... پرانے قسم ....اور خیالات کے لوگ۔ اگرچہ والدین اس بات پر بضد تھے کہ میں رہائش اپنے ہی گاؤں میں کروں لیکن میں اس کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ میری شادی بھی اپنے ہی گاؤں میں کرنا چاہتے تھے لیکن میں کسی ناسمجھ، سادا گنوار دیہاتی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس شہر اور اسکے لوگوں سے محبت ہونے لگی اور چاہتا تھا

کہ یہیں شادی کروں۔ خیر بات اس حد تک پہنچی کہ والدین سے تکرار ہوئی اور میں نے مستقل طور گھر چھوڑ ہی دیا۔ میری تعیناتی یہاں شہر کے جس کالج میں ہوئی وہاں میری ملاقات میرے ساتھ ہی عارضی بنیاد پر تعینات ہوئی اک لیکچرار کشش سے ہوئی۔ شہر کی رہنے والی کشش خوبصورت خوبرو، سمارٹ اور.....تھی۔ میں اُس میں دلچسپی لینے لگا۔ تعلقات بڑھتے گئے اور آہستہ آہستہ میری دلچسپی پیار کے حدوں کو چھونے لگی۔ ملنا جلنا، ہنسنا ہنسانا، گھومنا پھرنا اور پھر قسمیں وعدیں سب کچھ.... میرا پیار عروج پر تھا۔ اسکی تعنیاتی کی معیار ختم ہوگئی لیکن ہمارے تعلقات قائم رہے۔ دو سال بعد میرا تبادلہ دوسرے کالج میں ہوا۔'' دانش آج بولتے جا رہا تھا۔

''ارے صاحب۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چائے بھی پیجئے۔'' میں بیچ میں بول پڑا۔

دانش نے ٹھنڈی چائے کے دو گھونٹ پی لیے اور پھر بولنا شروع کیا

''اور صاحب۔ پھر دو دن کے بعد مجھے کشش ملی۔ اُسنے میرے تبادلے کے بارے میں سُنا تھا۔ پوچھا کہ میں دوسرے شہر کے کالج میں جا رہا ہوں تو اب.....میں اسکی بات سمجھ گیا۔ اور اُسے سمجھایا کہ میں ہر ہفتے کے بعد یہیں واپس آیا کرونگا۔ کمرہ جو رہنے کیلئے لیا ہے وہ بھی بدستور اپنے

ہی قبضے میں رکھونگا۔اس طرح ہفتے کے بعد آنا جانا رہیگا اور ہمارا ملنا جلنا بھی.....سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ میں اب چاہتا تھا کہ اس شہر میں مُستقل طور رہنے کیلئے کہیں اپنی جگہ لے لوں ۔ ایک دو کمرے بنا کر کشش کے ساتھ شادی کر کے وہیں رہُوں۔لیکن اسکے لئے تھوڑا انتظار کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ اِسی دوران جب میں ہفتے کے بعد شہر آیا تو کشش کو فون لگایا۔اُسنے فُون نہیں اٹھایا.....بارہا فون لگایا۔ رِنگ بجتی رہی لیکن فون نہیں اٹھایا۔ میں پریشان ہوگیا۔ کمرے میں جانے کی بجائے میں سیدھے اُس کا حال پوچھنے کیلئے اسکی ایک سہیلی کے پاس پہنچا۔ جہاں پتہ چلا کہ کشش کو دیکھنے لڑکے والے آرہے ہیں۔اسکا رشتہ کہیں طے ہونے والا ہے'' دانش یہی پر رُک گیا۔

اور پھر'' میں نے پوچھا

ٹھنڈی آہ بھر کر دانش نے کہا'' اور پھر....قصہ تمام ہوگیا''۔

تھوڑے وقفے کے بعد دانش پھر بولا'' جناب مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری اس روداد کو کیسے لے لینگے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا کیونکہ میری محبت اُتنی خام نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسکی منگنی جہاں ہوئی تھی اُس رشتہ سے کشش خود بھی خوش تھی۔ میں نے پھر یہ سوچا کہ اسکی خوشی میں کیوں نہ میں اپنی خوشی تلاش کروں۔ میں نے چُپ

سادھ لی۔لیکن اس شہر میں آنا جانا نہیں چھوڑا۔کبھی نہ کبھی..... کسی نہ کسی طرح اسکو دیکھ ہی لیتا.....اور صاحب آجکل وہ ایک مقامی سکول میں پڑھاتی ہے اور اسکے دو بچے ہیں جو دونوں ایک پرائیویٹ سکول میں زیر تعلیم ۔ دونوں ماں پر گئے ہیں۔ وہی چہرہ، وہی ناک وہی نقوش۔ وہ مجھے نہیں جانتے لیکن میں انکو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میں کشش کی ہر پل کی خبر رکھتا ہوں۔ اُسے بھی یہ معلوم نہیں کہ میں یہاں آتا رہتا ہوں۔ وہ اپنی زندگی میں مست ہے۔ اُسے کیا معلوم اور ویسے بھی .....لیکن اسکی محبت آج بھی مجھے یہاں کھینچ کر لاتی ہے۔ یہ کرایہ کا کمرہ اُن ہی دُنوں کی دین ہے۔ پیار و محبت نشانی جبھی اسے سنبھالے جا رہا ہوں۔'' وہ تھوڑا رک گیا اور پھر پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ کو ایک بات بتاؤں کہ بعض اوقات انسان تمام عمر کسی خواہش کی خاطر جی لیتا ہے کہ اس خواہش پر اسکی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہی خواہش اُس کی انا کا مسلہ بن جاتی ہے اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ چُپ چاپ کسی دن جب خواہش پوری کرنے کا وقت آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی انجانے لمحے میں وہ خواہش اُس سے بچھڑ گئی ہے..... ختم ہو گئی ہے اور تب ایسا لگتا ہے کہ جو ایک دل اس خواہش سے بھرا پڑا خالی خالی سا ہو گیا، ویران ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ میں نے اپنے دل کو ویران

ہونے نہیں دیا میرا دل ابھی کشش کی یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے۔ میں آج بھی وہی کھاتا ہوں، وہی پیتا ہوں وہی پہنتا ہوں جو اُن ملن کے دُنوں میں کھاتا پیتا پہنتا تھا۔ میری وہی عادات، وہی مزاج۔ کچھ نہیں بدلا۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں اب بھی اسکی محبت کا اُجالا ہے۔'' اسکے بعد وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

''عورت کے لئے زندگی میں محبت کا فلسفہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسکا دل فراغ ہوتا ہے۔ جہاں وہ دوسروں کو ڈھیروں محبت بانٹنا چاہتی ہے وہاں وہ کسی تھوڑے سے پیار سے تھوڑی سی توجہ کی طلبگار ہوتی ہے۔ اور وہ کبھی کبھی کسی چھوٹی توجہ یا پیار سے بہک جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت کبھی بھی اپنا پہلا پیار بھولتی نہیں... کبھی بھی نہیں''

یہ کہکر دانش اپنی کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر آکر سگریٹ سلگا کر پھونکنے لگا اور میں کشش کی کشش کا اثر دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

ہُما

ارے بھئی ۔تم اُداس کیوں ہو؟ کونسی پریشانی ہے؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے ؟ آخر کونسی بلا آن پڑی ہے؟ کون سی ایسی مشکل ہے جسکا حل نہیں''۔ میں نثار سے پوچھ رہا تھا جو خاموش میری سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں نہ جانے کس کی متلاشی ۔ چہرہ اُترا ہوا تھا اور نہ جانے کن ذہنی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرا ہوا تھا۔ میں نے اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

''بھئی ذرا کچھ بتا بھی دُو نا؟ دیکھو تمہارے کتنے احسان ہیں مجھ پہ۔ جب بھی مجھے کسی مصیبت یا مشکل کا سامنا کرنا پڑا تو تم نے ہی میری مدد کی۔ میں تمہارا اپنا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں اس وقت تمہاری کوئی مدد کر سکوں''۔ میں نثار کو زبان کھولنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اسنے ایک سرد آہ بھری اور اسکی آنکھوں سے موتی کے مانند آنسو ٹپک پڑے

''بھئی ۔کیا بتاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا'' آخر نثار نے زبان کھول

ہی دی'' میں بے آسرا ہو گیا۔ زندگی کی آخری سانس.....'' نثار ہچکولے کھا رہا تھا۔ ''میری زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی۔ اس بھری دنیا میں میرے لئے اب کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے صرف اُسی کو چاہا تھا، وہی میری منزل تھی۔ میں تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو گیا۔ میرے یار''۔ نثار کہے جا رہا تھا ''میرے گھر والے جذبات سے کھیل رہے ہیں، انہوں نے میری زندگی کو بے سُر بنایا۔ میرے حسین سپنے مجھ سے چھینے۔ سب کچھ جان کر بھی انہوں نے میری زندگی کی خوشیاں چھین لیں۔ گاؤں جانے پر بھی روک لگا دی ہے۔''

نثار جذبات میں بہک رہا تھا اور اب زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کا انگ انگ پھٹ رہا تھا اور اسکی سانس.....

پچھلے سال ہی نثار نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ چونکہ گھر میں روپیہ پیسہ کی کوئی کمی تھی، شہر میں اچھا خاصا کاروبار تھا اور گاؤں میں موروثی میوہ باغات۔ گھر والوں نے شہر کا کاروبار نثار کو سونپنے کا فیصلہ کیا اور اسطرح نثار نے اپنے والد کی دکان پر جانا شروع کیا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا اور باغات میں میوہ تیار ہو رہا تھا اور بھرائی کا کام شروع ہوا تھا۔ نثار کو گاؤں بھیجا گیا تا کہ وہ میوہ بھرائی کے کام کی دیکھ بال کرے۔ تین مہینے لگا تار نثار گاؤں میں ہی رہا اور جب وہ کام پورا کر کے شہر واپس لوٹ آیا تو اسکا من دکان پر بیٹھنے کو

نہیں کر رہا تھا وہ کھویا کھویا سا رہتا تھا اور ایک عجیب بے قراری اور بے چینی کا عالم تھا۔ اسکے عادات اور تیور ہی بدل گئے تھے۔ اب نثار اکثر خاموش رہتا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ اسکا حال جان سکوں۔ میری ضد کے سامنے اسنے آخر ہار مان لی اور.....

جس گاؤں میں نثار کے باغات تھے وہاں نثار جس گھر میں رہتا تھا انکی ایک سولہ سترہ سالہ بیٹی تھی۔ حسین رشکِ بہاراں، کھلتا ہوا چہرہ، گلابی ہونٹ، کالی لمبی لمبی زُلفیں نثار ان پر فدا ہوا تھا۔ ہما نام کی یہ لڑکی نثار کے دل کو بھائی تھی۔ محبت کی چنگاری کب بھڑک اٹھی اور دو دل کب ایکدوسرے کے قریب ہوئے پتہ نہیں چلا۔ پیار و محبت کی حسین دنیا کے یہ عاشق ایکدوسرے کے بغیر اب رہ نہیں سکتے تھے۔ عمر بھر ساتھ جینے اور مرنے کے وعدے ہوئے۔

اکتوبر کا آخری عشرہ تھا کہ ہما کے چچیرے بھائی کی شادی تھی۔ نثار اور اسکے گھر والے سب دعوت پر آئے اور ہما اور اسکے گھر والے تو پہلے ہی وہاں تھے۔ ہر طرف خوشی اور شادمانی تھی لیکن سب سے زیادہ خوشی نثار اور ہما کے چہروں پر جھلکتی تھی۔ دونوں موقعہ پا کر ایکدوسرے سے آنکھ چار کرتے۔ کسی نے ان کی حرکات کو بھانپ لیا، ویسے بھی گاؤں میں کہاں کوئی بات چھپتی ہے۔ دو چار لڑکے کے ایک طرف بیٹھے نثار اور ہما کا مذاق اُڑانے

لگے۔ نثار کو غصہ آیا اور ان میں سے ایک کی مار پیٹ بھی کی۔ ہما کی ماں ایکدم نمودار ہوئی اور نثار سے کہا

''نثار بیٹے۔اب رات ہوگئی ہے۔تم ہما کے ساتھ گھر جاؤ اور وہاں آرام کرو۔وہاں شاید کوئی نہیں ہوگا۔''

نثار نے موقعہ غنیمت سمجھا اور ہما کے ساتھ اسکے گھر گیا۔دونوں نے گھنٹوں پیار بھری باتیں کیں اور پھر ہما واپس شادی کی تقریب میں شرکت کرنے گئی اور نثار آرام کرنے لگا۔

صبح ہوئی اور نثار.....وہ ابھی شہر نہیں جانا چاہتا تھا۔وہ ہما سے پھر ملنا چاہتا تھا ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اُس لڑکے کے گھر والوں نے اسکا راستہ روکا جسکی کل رات اسنے پٹائی کی تھی۔آپس میں تلخ کلامی ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی پر بھی آئی تھی لیکن چند گاؤں والوں کی بیچ بچاؤ سے معاملہ پنٹایا گیا۔مگر بات کہاں چھپتی نثار اور ہما کی دل لگی کی داستان مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں مرچ مصالحہ ملا کے بیان کرنی شروع کی۔

اس واقعہ کے بعد ہما کی زندگی کی گاڑی ہی رُک گئی۔ہما کی شادی کی باتیں کہیں ہو رہی تھی لیکن.....وہ بھی رُک گئیں۔

نثار نے ایک دو ماہ کے بعد اپنے ماں سے دل کی بات کہی کہ وہ ہما سے شادی کرنا چاہتا ہے۔جونہی ماں نے بات سُنی وہ سکتے میں آگئی۔

''نثار تجھے کیا ہوا ہے؟ کہاں ہم اور کہاں وہ۔ اسکا باپ ہمارے باغات کی رکھوالی کرتا ہے، نوکر ہے ہمارا نوکر۔ ہم میں اور ان میں کس قسم کی برابری۔ یہ ہمارے خاندان اور ہماری عزت پر دھبہ ہوگا۔ بات یہیں پر ختم کرلو۔ کہیں تمہارے ابّو نے سُنا تو نہ معلوم کیا ہوگا۔ وہ ہما کے خاندان کو ہی ختم کردیگا۔ بھلائی اسی میں ہے کہ تم اس بات کو بھول جاؤ اور اپنے کاروبار کے ساتھ لگ جاؤ''۔

نثار کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ اسکا ابّو خشمناک اور تیز طرار ہے اور اس کی یہ بات ناگوار گزرے گی جسکا براہ راست اثر ہما کے گھر والوں پر ہوگا اور وہ انہیں برباد کرکے رکھے گا۔ اور نثار یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہما یا اسکے گھر والوں کو ناحق سزا ملے۔ اسکے لئے وہ ہما کو اپنی زندگی سے دور رکھنے کے لئے بھی ناچاہتے ہوئے بھی تیار ہوا تھا لیکن.....

''لیکن کیا؟'' میں نے نثار سے پوچھا

''میرے یار۔ میں تو ہما کو بھلا سکتا ہوں مگر ایک بات مجھے کریدتی ہے۔ وہ ایک نوجوان ان بیاہی لڑکی ہے۔ پورے گاؤں والے جانتے ہیں کہ اُسنے میرے ساتھ محبت کی ہے اسکی بہت بدنامی ہوئی ہے۔ محبت کرنا چوری یا گناہ نہیں مگر ہمارا سماج..... سزا مجھے نہیں ہما کو مِل رہی ہے۔ کون اسے اپنا جیون ساتھی قبول کریگا۔ وہ معصوم ہے اور اسکی کوئی خطا نہیں۔ میں

جانتا ہوں کہ اسکی زندگی پر مصیبت آنے والی ہے اور غموں کے بوجھ تلے وہ نہ معلوم کب دم توڑے گی۔'' نثار ہچکیاں کھا رہا تھا اور زور زور سے رو رہا تھا۔ اپنی بات وہ پورا نہیں کر رہا تھا اور ابھی بات ادھوری ہی تھی کہ سامنے ایک بس رُکی جسمیں سے ہما کسی نوجوان کے ساتھ ہنستے ہوئے اُتری۔

☆☆☆

کوئل نے کوُکنا بند کیا

چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا اور اسکی سفید اور نکھری ہوئی چاندنی دنیا پر اپنی نورانی کرنیں ڈال رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ پرانے قلعے کے سامنے کھمبے پر لگائی گئی ہالوجن لائیٹ کی روشنی قلعے پر پڑ رہی تھی۔ بازار بند ہو چکے تھے۔ اور دن بھر بازار میں گھومنے، چیخنے چلانے کے بعد وہ مجذوب قلعہ کی سیڑھی پر سو رہا تھا۔ میرا کوارٹر قلعے کے نزدیک تھا اور جس کمرے میں میرا بسترہ لگا رہتا وہ بالکل قلعے کے سامنے والے طرف تھا اور اُسکی کھڑکی سے قلعہ اور اُسے نزدیکی جگہ کا تمام نظارہ دیکھنے میں ملتا تھا۔ رات میرے سونے کا معمول کا وقت دس سے گیارہ بجے رات کا تھا آج بارہ بھی بج چکے تھے اور شہر کے کُلاک ٹاور سے گھڑیال نے بارہ بھی بجائے مگر نیند آج میری آنکھوں سے غائب تھی۔ ذہن میں قلعہ کی سیڑھی پر لیٹے ہوئے مجذوب کی روز کی اس بات کو چلاتے چلنا ''کوکو''

پہلے پہل میں نے اسے کبھی سنجیدہ نہیں لیا تھا مگر کل جب میں نے اسکی حقیقت جانی تو میں بہت سنجیدہ ہو گیا۔ یہ مجذوب تو کسی خاص مقام پر

پہنچا ہوا شخص ہے.....

شہر میں اس قدیم قلعے کو دیکھنے کے لئے شاید ہی کوئی آتا تھا۔ اگر چہ یہ ایک وقت اس علاقے کا سکریٹریٹ رہا تھا اور وہاں راجہ کے تمام دفاتر ہوا کرتے تھے مگر اب اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اسکو قومی وراثت اور Heritage قرار دیا تھا مگر عملی طور ایسا نہیں لگتا تھا۔ قلعہ کی حالت کافی خستہ تھی اور کھنڈر جیسے لگتا تھا اور اسکے آس پاس گندگی کے انبار تھے۔

اس قلعہ کو دو تین سو سال پہلے ایک راجہ نے تعمیر کیا تھا۔ میرے دفتر کے چپراسی آشُو کے بزرگ باپ کیشو رام نے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔

''صاحب جی۔ یہ قلعہ کبھی اس علاقے کی شان ہوا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں ہمارا شہر ایک خود مختار راجواڑہ تھا اور ہمارا اپنا راجہ تھا۔ جبھی کی یہ بات ہے کہ راجہ کو ایک قلعہ بنانے کی سوجھی جسمیں اسکے راج کے تمام سرکاری دفتر اور سرکاری خزانہ ہو۔ مگر لاکھ کوششوں کے بعد بھی یہ قلعہ تعمیر نہ ہوسکا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کاریگر اچھا خاصہ تعمیراتی سامان مگر جونہی قلعہ کی دیوار تعمیر کی جاتی وہ دوسرے دن گر جاتی اور یوں راجہ بہت پریشان ہوگیا تھا۔

کیشو رام کا یہ بیان خاصا دلچسپ تھا اور اس پر اسکا طرز بیان بھی کمال کا تھا اور اسکے بعد..... یہ قلعہ تعمیر کیسے ہوا۔'' میں نے پوچھا

''صاحب جی .....ابھی پوری بات تو سُن لیجئے خود ہی پتہ چلے گا کہ قلعہ پھر کیسے تعمیر ہوا۔ ہوا یُوں کہ راجہ، درویشوں اور فقیروں، سادھوں کے پاس جانے لگا اور اُن سے اسکا حل ڈھونڈنے لگا۔ پھر ایکبار ایک جنگل میں اُسے اک سادھو ملا اور اُسنے حل بتا ہی دیا۔ سادھو نے اُس سے کہا کہ قلعہ تبھی تعمیر ہوگا جب ایک بالک کی بلی دی جائیگی۔ وہ بالک بھی اپنی ماں کا اکیلا سنتان ہونا چاہئے۔ راجہ اگرچہ ظالم نہیں تھا مگر قلعہ کی تعمیر کیلئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ تبھی اُسنے اپنے وزیروں کی مدد سے ایک بیوہ عورت سے اسکا اکلوتا بیٹا کسی بہانے معاوضہ دیکر حاصل کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس عورت کو بتایا گیا کہ راجہ کے دربار میں اسکی ضرورت ہے اور وہ یہ سمجھی کہ اُسے شاید کسی کام کاج پر لگایا جائیگا۔ اُسنے یہ اچھا ہی سمجھا کہ معاوضہ بھی ملا اور بیٹے کو راج دربار میں کام بھی۔ پھر اسی بالک کو زمین میں گاڑا گیا اور قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی جو پھر کبھی نہ گری''۔

کیشو رام کی یہ باتیں سُن کر میرے ہوش اڑ گئے۔

''تم تو کہتے ہو کہ راجہ ظالم نہیں تھا۔ ایک بالک کو اسکی ماں سے غلط اور جھوٹ اور فریب سے لینا اور پھر زندہ زمین میں گاڑھ دینا۔ کیا یہ ظلم

نہیں یہ بہت بڑا ظلم ہے جسے انسانیت کبھی معاف نہیں کر سکتی''

میری بات سنتے ہی کیشو رام سے کہا

''صاحب جی۔ آپ پھر بیچ میں بولے۔ پہلے میری بات پوری ہونے دیجئے۔

''اب کونسی بات باقی ہے.....'' میں نے پوچھا

''صاحب جی۔ جب بالک کو زمین میں زندہ گاڑھنے کی بات اسکی ماں تک پہنچی وہ ننگے پاؤں دوڑتے دوڑتے آئی اور قلعہ کے دیوار کے ساتھ سر مار مار کر وہ بھی مر گئی۔ اور جب راجہ نے یہ سب کچھ دیکھا تو اُسے احساس ہُوا کہ اُسنے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ شرمندہ ہو، انادم ہوا۔ اُسنے قلعہ کے اندر ایک مسجد اور ایک مندر اس بالک کے نام پر بنوایا۔ شہر کے تمام غریبوں کو راج دربار سے مفت کھانا فراہم کرنے کا بندوبست کیا اور ہمیشہ اپنے کئے پر افسوس کرتا رہا.... یہ ہے پوری داستان اس قلعے کی.....''

''اچھا کیشو رام..... یہ جو مجذوب اس قلعے کے سامنے چلاتا رہتا ہے... وہ۔۔۔؟''

''صاحب جی... سُننے میں آیا ہے اور میری عمر بھی اب اسی سال سے اوپر ہوگی میں نے بھی دیکھا ہے کہ کوئی مجذوب شخص اِس قلعہ کے پاس لگا رہتا ہے۔ اور چلاتا رہتا ہے اور ہاں صاحب جی.... ایک اور بات ہے کیا

آپ نے نہیں دیکھا کہ اس قلعہ میں بہت سارے کوئل ہیں مگر کسی نے بھی قلعہ کے اندر انکا کوکنا نہیں سُنا ہے۔"

دوسرے ہی دن میں نے قلعہ کا رخ کیا۔ وہاں بہت ساری کوئل تھیں۔ درجنوں۔۔۔قلعہ کے باہر وہ کوکتی تھی مگر جوں ہی وہ قلعے کے اندر آتیں جہاں اُنکے بہت سارے گھونسلے تھے وہ خاموش ہو جاتیں۔ جیسے کوئی انکی زبان کاٹ دیتا ہو یا کوکنے کی طاقت چھین لیتا ہو۔ میں یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ جب میں باہر آیا تو سیڑھی پر بیٹھے مجذوب شخص نے مجھ پر ایک غضبناک نگاہ ڈالتے ہوئے "کوکو" کہنے کے بجائے کہا

"کوئل نے کوکنا بند کیا ہے"

☆☆☆

شین آپا

روزوں کا مہینہ تھا اور چاروں طرف سے مسجدوں اور خانقاہوں میں دُرود واذکار کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ روزہ افطاری کے بعد مسجدوں کی طرف جا رہے تھے تا کہ تراویح ادا کر سکیں۔ عجیب رُوح پرور منظر تھا۔ شین آپا بھی افطاری کے بعد گھر کے باہر آنگن میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ نہ جانے کس گہری سوچ میں تھی۔ پڑوسن آمنہ بی نے دو تین بار کھڑکی سے شین آپا کو آواز دی مگر وہ ان آوازوں سے بے سُن تھی۔ جب ذرا زور سے آمنہ بی نے اب آواز دی

''شین آپا۔ کیا بات ہے؟ آج میری آواز بھی نہیں سُن رہی ہو؟ سحری کیلئے کھانا بنایا؟ کیا پکایا ہے آج؟''

''آمنہ بہن۔ کدو اور ٹماٹر کی سبزی بنائی ہے اور کھانا بعد میں پکاؤں گی..... اور کیا بتاؤں میں آج کیا سوچ رہی تھی....؟'' شین آپا نے کہا

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' آمنہ آپا نے پوچھا

''آمنہ بہن۔ میری اک دیرینہ تمنا ہے۔ حج بیت اللہ پر جانے کی۔ اللہ نے تو اتنا دیدیا ہے کہ حج ادا کرسکوں۔ پیسے بھی میرے پاس ہیں، بس یہی سوچ رہی تھی۔ دیکھو آج کتنے لوگ رمضان کے مقدس ماہ کے روزوں کے بعد حج پر جارہے ہیں۔ کتنے خوش نصیب ہونگے وہ لوگ۔ کاش مجھے بھی وہاں سے بُلاوا آتا''

شین آپا جذباتی ہورہی تھی اور اسکی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

''شین آپا۔ اس میں فکر کرنے یا پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ انشاءاللہ بلاوا آئیگا اور آپ حج پر جاؤ گی'' آمنہ بی نے بھروسہ دیکر کہا۔

شین آپا نے اب تک زندگی کی ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی بہاریں دیکھیں تھی۔ ویسے جتنی بہاریں کسی کی زندگی میں آتی ہیں اُتنی ہی خزانیں بھی آتی ہیں۔ شین آپا کو اس عمر میں دیکھ کر یقیناً مشہور قول صادق لگتا ہے کہ کھنڈرات سے عمارت کا پتہ چلتا ہے۔ سُنا ہے کہ جب اُسکی شادی عباس میاں سے ہوئی تھی تب وہ نازک اندام، سروقد، تیکھے نقوش والی جوان لڑکی تھی۔ کمر تک چھولتی چٹیا، بڑی بڑی آنکھوں میں سُرخ ڈورے اور سُرخ ڈوروں کی حد بندی کرتی کاجل کی لکیریں، گہرے شوخ وسرخ ہونٹوں کے پیچھے انار دانوں جیسے جگمگاتے دانت اور سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتی تھی۔ عباس میاں بھی کم خوبرو نہ تھے۔ بچپن میں ہی یتیم ہوئے تھے اور مشکل سے

دسویں تک پڑھائی کی تھی۔ شین آپا کا باپ قصبہ میں ایک دکان چلاتا تھا اور عباس وہی پر ملازم تھا۔ اصغر میاں ضعیف العُمر شخص تھے اور شین اُسکی اکلوتی اولاد۔ عباس نہ صرف اسکو دُکان چلانے میں مدد دے رہا تھا بلکہ گھریلو کام میں بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا وہ بھی سگے اولاد کی طرح۔ ویسے بھی عباس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا لہذا وہ تن و من سے اصغر میاں اور اسکی بیگم کی خدمت والدین سمجھ کر کرتا تھا۔ دو تین سال ہی میں وہ جیسے اسی گھر کا فرد بن گیا۔ اُدھر شین نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور اسکے والدین فکر میں تھے کہ اسکے لئے کوئی اچھا اور مناسب رشتہ ملے۔ لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ رشتہ اُس لڑکے سے طے ہو جو خانہ داماد بننے کیلئے تیار ہو تا کہ وہ ان کے ساتھ اسی گھر میں رہے۔ کاروبار بھی سنبھالے اور بڑھاپے میں انکا سہارا بھی بنے۔ دوستوں، رشتہ داروں سے اس بارے میں بات چیت کا سلسلہ سا شروع ہو گیا لیکن من چاہا اور مناسب رشتہ کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔

''میاں .... کیا کوئی رشتہ آیا شین کیلئے؟۔ کہیں کوئی بات چلی؟''

اصغر میاں سے بیوی پوچھنے لگی جب وہ شام کو دکان بند کر کے گھر پہنچا۔

''بیگم۔ رشتے کی بات کئی جگہ چلی ہے اور کچھ رشتے بھی آرہے ہیں لیکن جب خانہ داماد کی بات آجاتی ہے سب مُکر جاتے ہیں۔ کہیں لڑکا تیار نہیں اور کہیں اسکے گھر والے آمادہ نہیں۔ کون چاہتا ہے کہ اپنا گھر چھوڑ کر

دوسرے کے گھر آئے اور کون اپنی اولاد اور وہ بھی آج کے زمانے میں لڑکا کسی اور کو دیدے....'' اصغر میاں نے بیوی کو بتایا۔

''تو اِس کا مطلب.....''

اصغر میاں نے بیوی کی بات کاٹ کر کہا'' نا امیدی کفر ہے بیگم۔ اور ہاں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ آج میرے دماغ میں ایک خیال آیا جبھی دکان بند کر کے نماز عشاء مسجد میں ادا کئے بغیر سیدھے آج گھر آیا۔ سوچا بات بھی ہو جائے گی اور نماز عشاء تھوڑی دیر بعد ادا کروں۔''

''کیا بات ہے۔ بتایئے نا؟'' اضطرابہ انداز میں بیوی نے اصغر میاں سے پوچھا

''میرے دماغ میں شین کے رشتے کیلئے ایک نام آرہا ہے۔ لڑکا جوان ہے، خوبرو ہے، شریف ہے، کام کرنے والا ہے، ذمہ دار ہے اور ہمارا جانا پہچانا ہے۔ خانہ داماد بننے کیلئے بھی تیار ہوگا۔ مجھے لگتا ہے یہ رشتہ اگر ہوتا ہے تو صحیح اور مناسب رہیگا۔'' اصغر میاں نے کہا

''کون ہے، کیا نام ہے لڑکے کا۔ کہاں رہتا ہے''

''عباس۔ اپنا عباس''

''عباس''

''ہاں عباس۔ کیا کمی ہے اسمیں۔ اسکے گھر میں کوئی نہیں ہے۔

اکیلا ہے اور ویسے بھی اب سمجھو ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک موزوں رشتہ رہیگا۔"

دونوں میاں بیوی اس رشتہ پر راضی ہوئے۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ لیکن شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ شین بھی خوش تھی کہ اُسے اپنا گھر نہ چھوڑنا پڑا اور اسے خوب رو جوان ساتھی مِلا۔ عباس بھی شاد تھا۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی خوبصورت بیٹی کا ہاتھ اور ساتھ ملا۔ بنا بنایا گھر ملا، کاروبار ملا اور ماں باپ ملے۔

زندگی کی گاڑی نے رفتار پکڑلی۔ شادی کے تین سال بعد اصغر میاں قلیل علالت کے بعد وفات کر گیا اور اس صدمے کے صرف ایک سال بعد اسکی بھی دنیا چھوڑ کے چلی گئی۔ عباس اور شین بہت دُکھی ہوئے پر رُب کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ یہی دنیا کی حقیقت بھی اور ریت بھی .....اور آہستہ آہستہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی پھر اپنی پٹری پر واپس آ گئی۔

دن گزرتے کہاں دیر لگتی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں تو ہر دم چلتی ہی رہتی ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کلینڈر کب ختم ہُوا۔ بیس سال گزر گئے۔ جوانی گذر گئی، بالوں میں چاندنی نمودار ہونے لگی اور دونوں میاں بیوی عباس اور شین مست انداز میں زندگی گزارتے گئے۔ کاروبار بھی ٹھیک چلتا رہا۔ کسی

کی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ماسوائے یہ کہ کوئی اولاد نہیں۔ دونوں میاں بیوی حقیقت پسند تھے اور یہ مان کر چلتے تھے کہ دنیا بنانے والے نے جو کچھ اُن کے مقدر میں لکھا ہوگا وہی ملیگا۔ نہ اُس سے زیادہ نہ اُس سے کم۔ ورنہ عام طور عورت اپنے وجود کو تکمیل ماں بننے میں مانتی ہے جو بہت حد تک صحیح ہوسکتا ہے لیکن شین وہ تو ضعیف الاعتقاد نہیں تھی۔

جاڑے کے دن تھے، موسم کافی ٹھنڈا تھا، برف پڑی تھی اور جم بھی گئی تھی۔ عباس اپنی دکان بند کر کے شام کے وقت گھر کی طرف آرہا تھا کہ سڑک پر چل رہے ٹرک نے بریک لگائی۔ چونکہ جمی ہوئی برف تھی، اس پر بریک لگانا بہت خطرناک ہوتا ہے، وہی ہوا جس کا ڈر ہوتا ہے۔ گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہوگئی اور پھسل کر لڑھک گئی۔ اسکی زد میں راہ چلتا عباس آگیا۔ بڑی مشکل سے اسے گاڑی کے نیچے سے باہر نکالا گیا لیکن تب تک اسکی سانسیں ختم ہو چکی تھیں۔ شین پر دُکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسکی کمر ٹوٹ گئی۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں لیکن پھر وہی بے بسی قدرت کے فیصلے کے آگے۔

خاوند کی موت کے بعد شین جواب شین آپا بن گئی تھی، اکیلئے اپنے آبائی مکان میں رہتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی رشتہ دار یا ہمسایہ آیا کرتا تھا۔ دکان بند ہوگئی، کوئی چلانے والا ہی نہ رہا تھا، اُسے کرایہ پر لگایا۔ مکان کا آدھا حصہ

بھی کرایہ پر دیدیا اور یوں اپنا گذارہ کرتی رہی ۔کبھی بھی دوسری شادی کرنے کا خیال بھی نہ ہوا۔ پانچ سال بعد شین آپا کو اپنے خاوند کے رُوڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہونے پر انشورنس کمپنی کی طرف سے معاوضہ کی رقم ملی۔اس نے یہ رقم اس نیت سے بنک میں رکھی کہ ان پیسوں سے وہ حج بیت اللہ کا مقدس فریضہ انجام دیگی۔اور آج حج بیت اللہ جانے کیلئے لوگ فارم بھرنے کی تیاری کر رہے تھے ۔ اسکی چاہت اور تڑپ بڑھنے لگی تھی۔ دوسرے دن شین آپا مقامی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس اپنی چاہت بیان کرنے گئی

''مولوی صاحب....میری تمنا ہے کہ اس سال حج بیت اللہ پر جاؤں ۔آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، خود حج کیا ہے، اس بارے میں میری رہنمائی فرمایئے۔''

''محترمہ۔ارادہ بہت ہی نیک اور اچھا ہے۔خدا آپ کا یہ مقصد اور آپکی چاہت پوری کرے۔لیکن حج کے کچھ اہم شرائط ہیں وہ پوری ہونی چاہیں ۔ مسلمان ہونا، حج کرنے کے اخراجات ہونے چاہئے اور بھی دوسرے شرایط۔عورت کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے وہ اکیلئے یا تنہا حج بیت اللہ پر نہیں جاسکتی ۔ اسکے ساتھ محرم کا ہونا لازمی شرط ہے۔محرم میں باپ، بھائی، بیٹا، خاوند شامل ہیں ۔ چونکہ آپکے خاوند فوت ہو چکے ہیں لہذا

دوسرے محرم میں کوئی آپ کے ساتھ جائے تو آپ جاسکتی ہیں'' مولوی صاحب نے تفصیلاً کہا۔

''مولوی صاحب.....اگر ان محرم حضرات میں کوئی موجود نہ ہو تو.....''شین آپا نے پوچھا

''تو محترمہ۔حج بیت اللہ پر جانا ناممکن ہے''امام صاحب نے جواب دیا

''کوئی تو رستہ ہوگا،طریقہ ہوگا مولوی صاحب۔میں کسی بھی قیمت پر حج کا فریضہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔''ہچکولے کھاتی شین آپا بولی

''محترمہ.....رستہ ہے اگر آپکو قبول ہو.....بس ایک ہی رستہ ہے وہ یہ کہ آپ دوسرا نکاح کریں اُس شخص کے ساتھ پھر حج پر جائیں تو جائز ہے اور ممکن بھی''۔مولوی صاحب نے کہا

یہ سُنکر شین آپا اُٹھ کر چلی۔گھر پہنچ کر بہت روئی.....بس یہی سوچتی کہ شرط بھی اتنی خطرناک....اور اسکے بغیر حج ناممکن۔میرے رب۔میں کیا کروں۔تو ہی علیم ہے تو ہی کوئی رستہ نکال۔ایک طرف حج پر جانے کی تڑپ اور دوسری طرف اسکے لئے یہ شرط۔شین آپا نے اور بھی کچھ علماء سے اس بارے میں رجوع کیا اور شرعی حکم جاننے کی کوشش کی مگر ہر جگہ یہی جواب کہ عورت بغیر محرم حج نہیں کرسکتی۔

قصبہ کا ہی ایک صاحب ثروت شخص بھی حج کیلئے جارہا تھا۔بہو

بیٹی اور پوتے، پوتیاں والا یہ شخص بھی اکیلا یہ فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اسکی بیوی پانچ سال پہلے مرگئی تھی۔ خواجہ عزیز نام کا یہ شخص اچھے خاصے کاروبار کا مالک تھا، بڑے اثاثے تھے اسکے پاس۔ مولوی صاحب کو جب اس کا پتہ چلا تو اسنے شین آپا کے گھر جا کر اسے مشورہ دیا کہ وہ خواجہ عزیز کے ساتھ نکاحِ ثانی کر یا وریوں وہ اسکا محرم بن جائیگا۔ حج سے واپسی پر باہمی رضامندی سے نکاح منسوخ کر کے پھر اکیلی رہ سکتی ہے اگر چاہے۔ پہلے شین آپا تذبذب میں رہی لیکن آخر کار خواجہ عزیز کے ساتھ نکاح کرنے پر تیار ہوگئی۔

دونوں خواجہ عزیز اور شین آپا حج بیت اللہ پر روانہ ہوگئے اور تکمیل حج کے بعد واپس آگئے۔ دو ماہ بعد شین آپا نے خواجہ عزیز سے علیٰحدگی چاہی اور نکاح فسخ کرنا چاہا مگر خواجہ عزیز نے صاف انکار کیا۔ شین آپا نے مولوی صاحب سمیت کچھ ذی عزت لوگوں سے رجوع کیا کہ وہ اکیلی اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گزارنا چاہتی ہے۔ انہوں نے خواجہ عزیز سے بات کی لیکن وہ بضد رہا کہ وہ طلاق نہیں دیگا۔ اُدھر شین آپا کسی بھی قیمت پر علیٰحدگی چاہتی تھی۔ مولوی صاحب کی بہت کوششوں کے بعد خواجہ عزیز اس بات پر راضی ہوا کہ وہ تنسیخ نکاح پر تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ شین آپا اپنا آبائی مکان اُسکے نام کردے۔ کچھ لوگوں نے خواجہ عزیز کو سمجھانے اور منانے کی کوشش کی کہ یہ شرط ٹھیک اور موزون نہیں مگر وہ پیسے کا پجاری تھا سمجھو مہاجن۔ ہاتھ

ملے موقعہ کو کیسے چھوڑتا۔ سمجھو اندھے کے ہاتھ میں بٹیر آیا تھا۔ پھر رہی شین آپا وہ بچاری.... چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ مکان اسکے نام کرنے کو تیار ہوگئی۔

مولوی صاحب اور دوسرے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک شین آپا زندہ رہیگی وہ اِسی مکان میں رہیگی اور بعد از مرگ خواجہ عزیز اسکا مالک ہوگا۔ شین آپا کو آزادی ملی، چھٹکارا ملا.... وہ گُم صم بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا سے کیا ہوگیا۔ اسی سوچ میں کھو کر اُسکی آنکھوں پر نیند کا غلبہ آگیا اور وہ سوگئی۔۔۔۔ ہمیشہ کیلئے.....

صبح شین آپا کا جنازہ مکان سے نکلا اور خواجہ عزیز مکان کے اندر داخل ہُوا۔

☆☆☆

اِنشاء

مایوسی اُسے چاروں طرف گھیرے ہوئے تھی۔ وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں اور پریشان پھر رہا تھا۔ کامیابی کی تمام راہیں اسے مسدود نظر آرہی تھیں۔ جب ناکامی اور نامرادی حد سے زیادہ بڑھی تو وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکا یک اس کے کان میں ایک آواز آئی۔ ''مایوسی موت ہے، ہمت سے کام لے اور آگے بڑھ۔'' یہ آواز کہاں سے آئی سلمان کچھ نہ سمجھ سکا۔ مگر اتنا ضرور سمجھ لیا کہ اُسے آگے بڑھنا ہے ہمت سے اور جوش سے۔ گریجویشن کے بعد بیکار ہونے سے اور کام کاج نہ ملنے سے زندگی کا مقصد فوت نہیں ہوتا۔ کوشش اور کشمکش سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان خیالات اور احساسات نے جیسے سلمان کی مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی اور وہ اپنے مستقبل کو شاندار دیکھنے کا خواب دیکھنے لگا۔ خوابوں نے چاہت کا روپ دھارا اور چاہت کشمکش میں بدل گئی۔

سلمان نے گاؤں چھوڑ کر شہر کا رُخ کیا۔ لوگوں سے ملتا رہا اور روز گار تلاش کرتا رہا۔ ایک دو ہفتے بعد ہی اُسے ایک نجی سکول میں پڑھانے کی نوکری مِل گئی۔ قلیل تنخواہ۔ پر مجبوری اور ضرورت پیشِ نظر تھی۔ سلمان جیسے اور بھی کچھ پڑھے لکھے نوجوان اس نجی سکول میں بہ حالتِ مجبوری کام کر رہے تھے اور ان میں راشد نام کا نوجوان بھی تھا۔ راشد ایک نزدیکی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُسے اُستاد کے پیشے سے کوئی بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن.....

راشد اکثر گُم صم رہتا تھا۔ سلمان نے صرف چند ہی دن میں اُس سے تعلقات قائم کئے کیونکہ اُسے راشد میں اپنی صورت نظر آئی تھی۔

''راشد۔ تم اکثر خاموش رہتے ہو۔ پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ اگر تمہیں یہ کام پسند نہیں تو اُسے کیوں نہیں چھوڑتے؟'' سلمان نے سکول بریک کے دوران ایک روز راشد سے پوچھ ہی لیا۔

''یہ سچ ہے کہ مجھے پڑھانے کا کام پسند نہیں۔ بچوں کے ساتھ پورے دن مغز ماری اور پھر ملتا کیا ہے تم بھی جانتے ہو۔ یہ تو میری مجبوری ہے۔ شہر میں رہنا میری مجبوری ہے اور اسی لئے یہ کام کر رہا ہوں۔'' سلمان بولا

''کون سی مجبوری؟''

''بھئی۔ میں تو اصل میں یہاں ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحانات کی کوچنگ کرنے آیا ہوں۔ میں ایک اچھا خاصا سرکاری افسر بننا چاہتا ہوں۔ میرے ماں باپ نے بڑی مشکل سے مجھے پڑھایا ہے۔ ان کا خواب ہے کہ میں کچھ ایسا جاب کروں جسمیں عزت بھی ہو اور پیسہ بھی۔ یہاں میں شام کے وقت کوچنگ کلاس میں جاتا ہوں۔ اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں رہنا۔ پھر رہنے کیلئے جگہ اور کھانا پینا۔ یہ ضروریات پوری کرنے کیلئے کوئی بھی نوکری کرنا مجبوری ہے۔ تھوڑے ہی پیسے ملیں تو کمرے کا کرایہ اور پیٹ پوجا ہو ہی جاتی ہے۔ ایکبار تو ویسے امتحان دیدیا مگر کامیاب نہ ہوسکا اور اب نئے سرے سے تیاری کررہا ہوں۔ امتحان پاس ہوجائے اور سلیکشن ہوجائے پھر یہ پڑھانے کی نوکری اور یہ جھنجھٹ.....اس سے چھٹکارا مل ہی جائیگا.....'' راشد نے اپنی خاموشی توڑ دی تھی اور پھر وہ مسلسل بولتے جارہا تھا.....اور سلمان یہ سب سُن رہا تھا۔ اُس کے دِل میں بھی ایک تمنا جاگ اٹھی۔ ایک اعلیٰ سرکاری آفسر بننے کی خواہش.....

''راشد۔ کیوں نہ میں بھی تمہارے ساتھ کوچنگ سینٹر جاؤں اور امتحان کی تیاری کروں.....کیا معلوم۔ مقدر ساتھ دے اور.....''

دونوں سلمان اور راشد اب اکٹھے کوچنگ کرنے لگے۔ سال بھر خوب محنت کی۔ راتوں کی نیند حرام کردی۔ رات دن یہی خواب دیکھتے رہے

اور بڑھا افسر بننے کے خواب نے انکی راتوں کی نیند اڑا دی۔ دن میں دس سے چار تک سکول میں پڑھانا اور پھر کوچنگ۔ کمرے میں ایکبار گھُس گئے تو کبھی کبھی دوسرے روز صبح سے پہلے باہر ہی نہیں نکلتے۔ کھانا پینا بھی بھُول جاتے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب امتحان کی تاریخ کا اعلان ہُوا۔ دونوں نے امتحان دیدیا۔ چند روز بعد نتائج آ گئے اور دونوں کامیاب قرار دئے گئے تھے۔ خوشی سے وہ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اتنے خوش گویا زمانے کی ساری خوشیاں اُن کے دامن میں ڈال دی گئی ہوں۔ انٹرویو بھی ہو گئے اور مقدر جاگ اُٹھا۔ دونوں منتخب ہوئے اور ریاست کی ایڈمنسٹریٹو سروسز میں انکا داخلہ ہوا اور وہ افسر ہو گئے۔ تعیناتی کے آرڈرز بھی اجراء اور راشد کو ریاست کے ایک کونے اور سلمان کو دوسرے کونے پر بھیجا گیا۔ خیر یہ بات کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی کیونکہ اچھی اور من پسند اعلیٰ نوکری ملی تھی اور خوشی کی انتہا میں باقی سب کچھ معمولی تھا۔ دونوں نے نئی پوسٹنگ جوائن کی اور زندگی کی گاڑی نے رفتار پکڑ لی.....

سلمان والدین کے سایہ شفقت سے دوران تعلیم ہی محروم ہُوا تھا۔ ماں باپ کی اکیلی اولاد..... مشکل سے ہی گریجویشن کی تھی۔ گھر میں اُسکے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور یہ حالت مجبوری شہر میں بہ سلسلۂ روزگار آیا تھا... لیکن مقدر.... مقدر نے یہی مجبوری اُسکی خوشی کا ذریعہ بنا دی....

سلمان کی پوسٹنگ اب اُس شہر میں ہوئی تھی جو اُسکے آبائی گاؤں سے سینکڑوں میل دور تھا لہذا اسکا گھر آنا کبھی کبھار والا معاملہ ہو کے رہ گیا۔ ویسے بھی گھر میں اور کوئی تھا نہیں۔ بس پُرانا کچا بوسیدہ مکان جس کے آدھے حصہ میں اسکے چاچا کی فیملی رہتی تھی۔ سلمان والے حصّے میں دو چھوٹے سے کمرے تھے۔ پھر بھی جب کبھی سلمان گاؤں آتا تو یاروں دوستوں سے مل کر دوسرے ہی روز واپس شہر چلا جاتا۔ اب جیسے وہ شہر کا ہی ہو کے رہ گیا۔ دستور زمانہ ہے کہ افسروں کے گھروں، سرکاری رہائش گاہوں اور دفتروں کے ہاں لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے لیکن خاص بات یہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگ یعنی سرمایہ داروں اور پیسے والوں کا اِن افسروں کے ساتھ آنے جانے کا خاص تعلق ہوتا ہے۔ پھر ان افسروں کے ان بڑے لوگوں کی نجی دعوتوں اور محفلوں میں جانے کا بھی رواج ہے۔ سلمان بھی اسی سسٹم کا حصّہ بن گیا اور سانچے میں ..... شہر کا سب سے بڑا ٹھیکدار اصغر خان وہ سب افسروں کا خاص دوست تھا۔ شاندار کوٹھی کا مالک بڑا ہوشیار، پُرمغز اور پیسے والا آدمی۔ وہ کہاں پیچھے رہتا۔ اُس نے سلمان کو اپنے گھر دعوت پر بُلایا۔

''سلمان صاحب۔ آج میں نے یہ دعوت صرف اور صرف آپ کے اعزاز میں رکھی ہے۔ اِسی لئے کسی اور کو اس دعوت میں نہیں بُلایا ہے۔ پُوچھئے کیوں؟'' ٹھیکدار اصغر خان نے سلمان کا استقبال کرتے ہوئے کہا

''کیوں؟'' سلمان نے پوچھا۔

''جب سے آپ اِس شہر میں آئے ہیں میں آپ کے کام کرنے کے طریقے کو دیکھ رہا ہوں۔ میں آپکے کام کاج کے طریقوں اور حُسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ چھوٹی عمر میں آپ کو رب نے اتنے اوصاف سے نوازا ہے ماشاءاللہ۔ جبھی میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو صرف آپکو گھر پر مدعو کروں گھر والوں کی بھی یہی خواہش تھی کیونکہ میں اکثر آپ کے بارے میں گھر میں ذکر کرتا رہتا ہوں۔ سوچا دعوت کی دعوت ہوگی اور گھر والوں سے تعارف بھی ہو جائیگا۔'' اصغر خان بس کہے جا رہا تھا

''یہ لیجئے ٹھنڈا پہلے ہی آ گیا۔ اَرے عُبدل گھر والوں کو بُلاؤ۔'' اصغر خان نے اپنے گھریلو نوکر سے کہا۔

''سلمان صاحب۔ یہ میری بیگم عارفہ ہے اور یہ ہے ہماری اکلوتی لاڈلی بیٹی رؤمانہ ہے۔ میری تو ایک ہی اولاد ہے۔ بس رومانہ۔ ابھی حال ہی میں بے اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ خیر شکر رب الکریم کا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں اللہ کا دیا سب کُچھ ہے''۔

اس کے بعد سلمان کا اصغر خان کے ہاں قریباً ہر چھٹی پر دعوت پر جانا معمول سا ہو گیا۔ تعلقات بڑھتے گئے اور اب سلمان ایسے بھی کبھی خود ہی اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ سلمان کو اس گھر کی کچھ باتیں بہت پسند آنے

لگیں۔ ٹھیکدار کا صاف گو، دیانتدار اور محنتی ہونا۔ اسکی بیگم کا عام گھریلو عورتوں کی طرح گھر کا کام کاج خود کرنا، نوکروں کا صرف باہری کام کرنا اور بیٹی کو اچھی تعلیم و تربیت دینا۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ اسکا خوب سیرت ہونا۔ امیر زادی ہونے کے باوجود رومانہ کا سادہ ہونا... یہ سب باتیں سلمان کو بے حد اچھی لگیں۔

آنے جانے سے تعلقات بڑھتے گئے، تعلقات میں نزدیکیوں نے رشتے کی صورت اختیار کی اور سلمان اور رومانہ کی شادی ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی خُوش اور ٹھیکدار اور اسکی بیگم بھی شادمان۔ کچھ عرصہ بعد سلمان کا تبادلہ ریاست کے دار الخلافہ کے ایک دفتر میں ہُوا۔ وہاں روز گھر آنا جانا ناممکن تھا لہذا ہفتے کے بعد چھٹی لیکر آنا پڑتا تھا۔ دار الخلافہ میں سلمان کو رہائش کیلیے سرکاری کوارٹر ملا۔ سلمان اور رومانہ دونوں نئی جگہ نئے کوارٹر میں چل دیئے۔ اس کوارٹر کے نزدیک ہی یونیورسٹی کا گرلز ہوسٹل بھی تھا۔ شہر کا یہ پاش ایریا تھا اور یہ جگہ بھی خوبصورتی اور صفائی کے لحاظ سے قابلِ دید تھی۔ اب سلمان دن کو آفِس چلا جاتا اور رومانہ گھر میں بیٹھا کرتی تھی۔ پہلے رومانہ تھوڑی سی بوریت محسوس کرتی رہی لیکن نزدیکی گرلز ہوسٹل میں مقیم چند لڑکیوں کے ساتھ رابطے کے بعد تنہائی کی بوریت بھی ختم ہوگئی۔ وہ ان سے مل کر پہروں باتیں کرتی۔ کبھی وہ اسکے پاس آتیں اور کبھی رومانہ ان کے

پاس جاتی۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا کہ رومانہ کی ہوسٹل گرلز کی ساتھیوں میں ایک لڑکی انشاء سے گھر میں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھی۔ رومانہ اور انشاء دونوں باتوں میں مصروف تھیں اور ہنس رہی تھیں کہ سلمان بھی آ گیا۔ دونوں سہلیاں کھڑی ہو گئیں۔

''آداب'' انشاء نے سلمان کو سلام کی۔

''بیٹھئے.... آپ کیوں کھڑی ہو گئی۔'' سلمان نے کہا

''سلمان۔ یہ انشاء ہے۔ ساتھ ہی گرلز ہوسٹل میں رہتی ہے یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔'' رومانہ نے انشاء کا تعارف کرایا۔

''گڈ۔ آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ آپ کا سبجیکٹ ؟'' سلمان نے پوچھا

''سر۔ میرا سبجیکٹ سوشالجی ہے ابھی فائینل ایم اے کر رہی ہوں'' انشاء نے جواب دیا

رومانہ اور انشاء کے تعلقات بڑھتے گئے اس حد تک کہ وہ اب ایکدوسرے کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتی۔ انشاء، نوجوان، خوبصورت، ہنس مکھ، حاضر جواب اور ملنسار تھی لہذا بہت جلد گھل مل جاتی۔ اب سلمان اسکے ساتھ پہروں بیٹھتا اور بے تکلف باتیں کرتا۔ رومانہ کو بھی یہ پسند تھا۔

پانچ چھ ماہ بعد سلمان کو فون آیا کہ اسکی ساس عارفہ کی صحت خراب ہوگئی ہے۔ وہ جلدی جلدی آفس سے کوارٹر کی طرف چل پڑا

''رومانہ۔ ابّو کا فون آیا تھا کہ اماں کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ ہمیں جانا چاہئے'' سلمان نے گھر آ کر ہی رومانہ سے کہا

''سلمان ۔ خیر تو ہے یہ اچانک .....'' رومانہ کی آنکھوں میں آنسوؤں آ گئے

''خیر ہے۔ ایسی کوئی گھبرانے والی بات نہیں ۔ اب ابّو نے خبر دیدی ہے تو میں چاہتا ہوں دونوں مل کر آئیں.....اور کچھ نہیں۔''

دوسرے روز صبح دونوں نے کوارٹر کے باہری گیٹ کو بند کر کے نکلنا شروع کیا تو انشاء سامنے آ گئی اور پُوچھنے لگی

''کیوں....کیا بات ہے۔ چُوری چُھپے کہاں میاں بیوی جا رہے ہیں۔''

''ابّو نے فون کیا ہے کہ اماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس لئے دو تین دن کیلئے جا رہے ہیں۔'' رومانہ نے کہا

''اچھا یہ بات ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ طبیعت بگڑ بھی جاتی ہے اور ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔ انشاء اللہ اماں بھی ٹھیک ہو جائیگی۔ خیر اچھا ہے خبر پرسی کے بہانے اماں ابّو سے بھی ملو گے۔ لیکن یار.....جلدی

آنا۔ ہمیں اکیلئے چھوڑ کر جا رہے ہو.....'' انشاء نے کہا

''چھوڑ کہاں جا رہے ہیں۔ چند دن کی ہی بات ہے۔''

میکے پہنچ کر رومانہ نے دیکھا کہ اماں کی حالت تھوڑی خراب ہے۔ دونوں میاں بیوی چار دن وہیں رہے۔ واپس چلتے مگر اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی الجھن تھی۔

''رومانہ۔ ماں کی طبعیت ابھی ٹھیک نہیں اور اِن حالات میں ہمارا یہاں سے نکلنا بھی مناسب نہیں۔ لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا دفتر جانا بھی ضروری ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔'' سلمان رومانہ سے کہہ رہا تھا۔

''سلمان ....آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ماں کو اِس حالت میں چھوڑنا کسی بھی حالت میں ٹھیک نہیں۔ اسکا ہمارے سِوا ہے ہی کون۔ ابا جان یہاں اکیلئے پڑ گئے ہیں ان کی بھی صحت اچھی نہیں لگتی.....'' رومانہ نے کہا

''تو تم ہی بتا اب کیا کریں؟'' سلمان نے رومانہ سے پوچھا

''سلمان۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری ایک بات مان لو۔ آپ واپس جاؤ۔ آپ سرکاری افسر ہیں۔ آپ پر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ میں یہاں کچھ دن اور رُک جاونگی۔ جونہی اماں کی طبعیت میں تھوڑا سا سدھار آجاتا ہے میں آؤنگی مجھے معلوم ہے آپ کو بھی میں تکلیف ہوگی، دل نہیں لگے گا، ٹائم پر صبح کھانا پینا

نہیں ملیگا۔لیکن.....'' رومانہ کہے جارہی تھی

''ٹھیک ہے۔ میں ویسا ہی کرتا ہوں جیسا تم کہتی ہو۔لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ جوں ہی کی اماں کی طبیعت ٹھیک ہو جائیگی تم چلی آنا۔ میں تمہارے بغیر ایک دن بھی مشکل سے گزار پاؤں گا۔ تیری یاد بہت ستائیگی جلدی آجانا'' سلمان نے رومانہ سے کہا

''سلمان۔ میں کہاں اپنی چاہت یا مرضی سے یہاں رُکی ہوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا محسوس کرونگی۔تم میری جان ہو۔تم میرے سب کچھ ہو.....''

سلمان واپس اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوا اور رومانہ ماں کی دیکھ بال کیلئے میکے میں ٹھہری۔

دن گزرتے گئے۔ ہفتے اور اب مہینے۔ دو ماہ کے بعد بھی اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ رومانہ پریشان تھی۔ ذہنی الجھن کا شکار ہوگئی۔ ایک طرف ماں کی صحت کا خیال اور دوسری طرف خاوند سے دوری اور اسے والہانہ لگاؤ کا احساس.....اسکا من اُداس ہونے لگا۔ بس یہی سوچتی رہتی....

''سلمان اس وقت کہاں ہوگا۔کس حال میں ہوگا۔ کھانا اچھی طرح کھایا ہوگا کہ نہیں۔ کپڑوں پر پریس کسی نے لگائی ہوگی۔ آفس سے

واپس کوارٹر پر پہنچکر وہاں مجھے نہ پاکر اسکی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ کیا کرتا ہوگا.....دروازوں کو تکتا ہوگا اور مجھے یاد کرکے اسکی آنکھیں نم ہوتی ہونگی.....''

اسی روز دوپہر کو جب رومانہ بازار نکلی تو اُسے رستے میں اچانک انشاء ملی۔

''انشاء تم..... یہاں کیسے؟'' رومانہ نے پوچھا

''رومانہ.....ہم کلاس کی لڑکیاں یہاں ایک دن کے ٹور پر آئیں تھیں اور اب شام کو واپس جانا ہے.....اور تم ٹھیک ہُو نا؟...'' انشاء نے پوچھا

''میں تو ٹھیک ہوں۔ تم بتا سلمان ٹھیک ہے نا؟۔ کیسا ہے کیا کر رہا ہے۔ میری آنکھیں ترستی ہیں اسکو دیکھنے کیلئے۔ اُسکی بھی آنکھیں ترستی ہونگی۔ میرے بارے میں تم سے کیا کہتا رہتا ہے؟.....''

رومانہ جذباتی انداز میں بُولتی جارہی تھی اور انشاء.....

.....اُسنے ایک لمحہ کیلئے رومانہ پر نظر ڈالی اور پھر مسکرائی۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا جس سے رومانہ کے خوابوں کا بھرم ٹُوٹ گیا۔

☆☆☆

نصیب کور

نصیب کور اب کمزور بھی تھی اور کم گو بھی۔ تیسری شادی اور کل ملا کر چار بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کے جسم میں تن کر کھڑا ہونے اور چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے خوبصورت قد اور اعضاء کی دلکش مناسبت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جوانی قیامت کی رہی ہوگی۔ تقدیر نے نصیب کور کے ساتھ بھی عجیب کھیل کھیلا تھا۔

تقسیم ملک کے دوران جب ہر طرف فسادات کی مارکاٹ میں اقلیتی فرقہ کے لوگ اپنے اپنے علاقوں سے بھاگ کر دوسرے علاقوں میں جا رہے تھے نصیب کور بھی اپنے خاوند اور چار سالہ بچے کے ساتھ سرحد کے اُس پار اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری طرف بھاگنے لگی۔ مارنے کیلئے کئی لوگ ان

کو تلاش کر رہے تھے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ چہرے پہ موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف ایک عجیب سی دیوانگی اور وحشت کا دور دورہ تھا۔ برہنہ تلواریں اور نیزے چاروں طرف مصروف رقص تھے۔ بجلی کی سی چمک کے ساتھ کوندتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں سرتن سے جدا کر دیتے تھے۔ امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ نہ آنکھوں کی مروت نہ دلوں کی محبت باقی رہی تھی۔ اپنے بھائی بہنوں کے قتل اور اغواء کا انتقام .....نصیب کور، اسکا خاوند اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے چوری چھپے بھاگ رہے تھے کہ کہیں سے گولی چلی اور نصیب کور کا خاوند اور بیٹا دونوں ڈھیر ہو گئے۔ دونوں کو مرتے دیکھکر نصیب کور پر غشی طاری ہوئی.....اور جب اسکی آنکھیں کھلیں اسنے اپنے آپ کو ارباز کے گھر میں پایا۔ ارباز بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے انتقام اور بدلے کے جذبے کے تحت تلواریں اُٹھائی تھیں اور اُسی دیوانگی اور خون خرابے میں نصیب کور کا خاوند اور اسکا بیٹا مارا گیا تھا۔ نصیب کور چونکہ بے حس و ہوش زمین پر پڑی تھی تبھی ارباز کی نظر اس پر پڑی تھی۔ نصیب کور غضب کی خوبصورت تھی۔ دھرتی پر حور.....ارباز اسے اپنے گھر لے آیا اور پھر.....کچھ وقت کے بعد اسکے ساتھ شادی کی۔ نصیب کور بے بسی اور نیم ہوشی کی حالت میں سب کچھ سہہ گئی۔ شربت سمجھ کر زہر کا گھونٹ پی لیا۔ ایک سال کے بعد ایک لڑکے کو جنم

دیا.....ارسلان.....

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی.....ارسلان دو سال کا ہو گیا۔ اِدھر سرحد پر ماحول ٹھنڈا ہونے لگا۔ سرحد کے دونوں طرف کے ملکوں نے ایک سمجھوتہ کیا جسکے تحت یہ اجازت دی گئی کہ اگر کسی خاندان یا گھر کا کوئی فرد سرحد کے دوسرے طرف کسی طریقے سے پھنس گیا ہے وہ اپنے گھر والوں کے پاس سرحد پار جا سکتا ہے۔ نصیب کور نے بھی یہ سُن لیا۔ اور ایک دن وہ چوری چھپے بیٹے کو لیکر سرحد کے اس پار اپنے دو بھائیوں کے پاس آئی۔ ارباز کو جب یہ معلوم ہوا تو اُسنے سفارت خانے کی وساطت سے دعوی کیا کہ نصیب کور اسکی بیوی ہے اور ارسلان اسکا بیٹا.....کچھ شنوائی اور قانونی کاروائی کے بعد وہ ارسلان کو واپس لینے میں کامیاب ہوا لیکن نصیب کور اپنے بھائیوں کے پاس رہی۔ نصیب کور ابھی جوان تھی، خوبصورت بھی تھی بھائیوں نے اسکی شادی اپنے فرقے کے ایک شخص سے کی اور اسطرح نصیب کور کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ دن گزرتے گئے.....مہینے.....سال اُسنے دو بیٹوں کو جنم دیا اور اب اسکے بیٹے بھی سن بلوغ کو پہنچنے لگے تھے۔ اب خاوند بھی تھا، گھر بھی تھا اور بچے بھی...رشتہ دار بھی اور اپنے لوگ بھی.... پر نصیب کور اب گم صم رہتی تھی اسکے چہرے سے مسکان غائب تھی.....

ایک روز جب اُسنے سنا کہ انکا ایک پڑوسی سرحد کے اُس پار جا رہا

ہے جہاں اسکے رشتہ دار اسی گاؤں میں رہتے ہیں جہاں اسکی دوسری شادی ہوئی تھی تو اسکو ارسلان کی یاد کچھ زیادہ ہی ستانے لگی....." کیا معلوم وہ کیا کرتا ہوگا...اسکا حال کیا ہوگا....."

"بھائی صاحب.....سُنا ہے کہ آپ سرحد کے اُس پار اپنے رشتہ داروں سے ملنے جارہے ہیں....." نصیب کور اپنے پڑوسی راج محمد کے پاس گئی اور اسے کہنے لگی۔

"ہاں۔بہن... پرسوں جارہا ہوں۔ پندرہ دن کا ویزا لگا ہے۔ بڑی مشکل سے....دس سال انتظار کرنا پڑا...دس سال پہلے عرضی دی تھی...." راج محمد نے کہا

"بھائی صاحب....آپ سے ایک بات کرنی.....مگر...."

"کیا مگر.....بولو بہن نصیب بولو....."

"بھائی صاحب...جس گاؤں میں آپ کے رشتہ دار ہیں جہاں آپ جارہے ہے میری دوسری شادی ایک مسلمان سے وہی پر ہوئی تھی....."

"ہاں....بہن معلوم ہے...اور وہاں تمہارا ایک بیٹا بھی تھا....میں نے سب سُنا ہے۔"

"بھائی صاحب.....مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ میرا وہ بیٹا کہاں ہے اور کس حال میں ہے.....ارسلان اسکا نام رکھا تھا....."

''بہن.....میں کوشش کروں گا کہ اسکا کچھ پتہ چلے۔تم مجھے اسکے باپ کا نام پتہ دیدے انشاءاللہ میں اپنے رشتہ داروں کی مدد سے اسکے متعلق جانکاری حاصل کروں گا۔ پندرہ دن کا میرا ویزا ہے۔ واپسی پر تمہیں بتاؤں گا جو بھی معلوم ہو جائیگا....''

بیس دن گزر گئے راج محمد کا کچھ پتہ نہ تھا۔شام کا وقت نصیب کور انتہائی اُداسی اور خاموشی کا پیکر بنی تھی۔ دونوں بیٹے کہیں باہر تھے اور وہ اکیلی گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی....

''آداب۔بہن....کیسی ہو....'' راج محمد گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔

''بھائی۔صاحب....آپ.....کب آئے؟''.....نصیب کور نے پوچھا

''بہن....آج ہی آیا اور ابھی گھر میں صرف چائے پی اور تمہارے پاس آیا''

''بھائی صاحب.....کچھ پتہ چلا.....'' نصیب کور بڑی بے تابی سے پوچھ رہی تھی

''بہن .....میں تمہارے ارسلان سے ملا.....ماشاء اللہ خوبصورت ....نوجوان....بڑا مہذب .....'' راج محمد نے کہا۔

''اور بھائی صاحب.....'' نصیب کور ارسلان کے بارے میں اور کچھ سننے کیلئے بے تاب تھی وہ تو یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ میرے رشتہ داروں کے ہاں آنا جانا ہے۔اور ہاں تمہارے بارے میں سُن کر پھولے

نہیں سمایا.... بار بار پوچھ رہا تھا۔ میری ماں کیسی ہے۔ کیا اسکو میری یاد آتی ہے.....میرے بارے میں کیا سوچتی ہے؟....راج محمد کہے جا رہا تھا اور نصیب کور کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نصیب کور آج اتنی خوش تھی کہ جیسے زمانے کی ساری خوشیاں اسکو حاصل ہوئی ہوں۔ اب وہ اُس گھڑی کے انتظار میں تھی جب وہ اپنے ارسلان کو دیکھے۔ بڑے احتیاط اور طریقے سے اُس نے اپنے بھائیوں سے اس بارے میں بات کی اور وہ.....وہ اس بات پر خاموش رہے...نہ نا نہ ہاں۔ لیکن نصیب کور کی تڑپ اور کسی طریقے سے اُسنے ارسلان کو پیغام بھیجا کہ وہ سرحد سے اس پار ماں سے ملنے کیلئے ویزا حاصل کرے۔

اور وہ دن آ ہی گیا جب ارسلان سرحد کے اس پار آ گیا۔ واقعی خوب رو خوش پوش نوجوان۔ اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہ ایک مقامی ہوٹل میں ٹھہرا ....کیونکہ نصیب کور کے بھائی اس بات پر راضی نہیں تھے کہ ارسلان انکے گھر آئے.....''ہماری برادری اور رشتہ دار دوست کیا کہیں گے.....مُشکل سے اُن حالات اور واقعات کو بھول گئے ہیں.....'' نصیب کور کے بھائیوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی نفرت تھی۔

''وہ تو اتنے عرصے کے بعد....بڑی مشکل سے سرحد سے اس پار چند دنوں کیلئے آیا ہے۔ وہ یہاں آئے تو.....'' وہ اپنے بھائیوں کو سمجھا رہی

تھی۔ ''ماں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہوئی ہو۔ نصیب کور کے دو بیٹے بھی اب بول پڑے۔

''بیٹا.....سنو.....وہ تمہارا بھائی ہے.....بھائی'' نصیب کور نے کہا

''کیسا بھائی۔ نہ دین کا نہ دھرم کا.....ہم سردار ہیں، تم سردارنی ہو اور وہ مسلمان.....ہمارا کوئی رشتہ نہیں.....وہ ہمارا بھائی نہیں نہ ہم اسکے بھائی ہیں.....'' دونوں بیٹے بڑے غصیلے ہو گئے

''بیٹا مانا کہ تم اسکے بھائی نہیں ہو لیکن میں.....میں تو ماں ہوں.....جیسی تمہاری، ویسی اسکی ماں''.....نصیب کور کہہ رہی تھی کہ باہر آنگن کا دروازہ جو کھلا تھا وہ بند کر کے کوئی باہر چلا.....

دو گھنٹوں تک نصیب کور کی بھائیوں اور بیٹوں سے بحث ہوتی رہی مگر بے سود۔ آخر اسنے فیصلہ کیا وہ ہوٹل میں جا کر ارسلان کے پاس آج جا بیٹھے گی ہوٹل پہنچ کر دیکھا کہ اسکا کمرہ لاک کیا ہوا ہے۔

''منیجر صاحب وہ کمرا بند کیوں ہے وہاں جو نوجوان رہتا ہے وہ کہاں گیا ہے''۔

''میڈم۔ وہ نوجوان تو ابھی ایک گھنٹہ پہلے کمرہ چھوڑ کر چلا گیا....''

''کہاں''

''میڈم بتا رہا تھا کہ اسکا ویزا ختم ہو گیا ہے''

''لیکن.....اسکا ویزا ابھی پانچ دن کیلئے تھا.....''

''میڈم ہمیں کیا معلوم....ویسے پہلے ہمیں بھی بتایا تھا کہ پانچ دن ادھر ہی ہوٹل میں ٹھہرے گا.....لیکن آج دن وہ کسی سے ملنے گیا تھا لیکن دبے پاؤں ہی واپس آ گیا اور کمرہ خالی کر کے چلا گیا.....''

نصیب کور پر پھر وہی اُداسی چھا گئی وہی خاموشی۔ وہ کمرے کے دروازے کو تکتی رہی جس پر چھوٹے حروف میں لکھا تھا

''نصیب کور میری ماں ہے''

☆☆

فیصلہ ابھی باقی ہے

اپنے آپ تنہائی میں آنے والی مسکراہٹ اصل ہوتی ہے۔ ہر تکلیف بناوٹ اور ریاکاری سے پاک.....جو صرف اپنے دل کو خوش کرنے کیلئے ہونٹوں پر آتی ہے دوسروں کیلئے نہیں.....وہ کبھی کبھار خود سے باتیں کرتا اور ہنستا تھا۔

انوپ سنگھ سرحد پار کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اِدھر آیا تھا۔ آزادی کو ہمیشہ کوستا رہتا تھا کیونکہ اس میں اسکا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔ جائیداد، بیوی، بچے، بوڑھے ماں باپ.....اتنے سال گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے وطن کو بھُلا نہیں سکا تھا۔ اکثر ہمیں خوابوں کی روئداد سنایا کرتا تھا۔ خوابوں میں اپنے آبائی مکان میں جاتا تھا جہاں اسکا بچپن بیتا تھا۔ وہاں وہ اب بھی اپنے عزیزوں اور پرکھوں سے ملتا جن کے ساتھ اب اسکا کوئی تعلق موجود نہ تھا.....اکثر کہا کرتا تھا۔

''بیٹا سکول میں پڑھ رہا ہے جلدی کالج جانے والا ہے اور پھر نوکری مل جائیگی۔ بیٹی کے ہاتھ بھی پیلے کرونگا۔ وائے گورو کو منظور ہوتو

معاوضہ کی صورت میں یہی مکان ملے گا۔ تین کمرے، ایک ورنڈا اور آنگن .... کسی بیچارے مسلمان کا ہے اور وہ اب سرحد کے اُس پار ہے اور وہاں وہ بھی کسی ہندو یا سکھ کے مکان میں دن گزار رہا ہوگا۔ اُسے بھی کچھ غم ستاتے ہونگے اپنے اور پرائیوں کے.... لیکن ہمارے اچھے دن بھی آئینگے۔ حالات ٹھیک ہونگے۔ مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی پر چھا جاتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں، برستے ہیں پھر خالی ہو کر اُڑ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ پھر دھوپ نکلتی آتی ہے''۔

انوپ سنگھ تقسیم ملک سے پہلے سرحد کے اُس پار گاؤں کا خاصا بڑا کاروباری آدمی تھا۔ اسکی بہت ساری دکانیں، زمین، جائیداد تھی۔ گھر میں اسکی بیوی اور دو بچے ایک لڑکا اور لڑکی..... پورے علاقے میں اس کی ایک پہچان تھی۔ پیسے والا آدمی تھا۔ کسی کو بھی کبھی بھی پیسے کی ضرورت ہوتی تو انوپ سنگھ کے پاس جاتے۔ بیٹی کی شادی ہو، یا بیماری کے علاج کے لئے پیسے کی ضرورت، مکان بنانا ہو بچے کی تعلیم وتربیت کے لئے خرچ کی ضرورت، انوپ سنگھ سب کے لئے ایک بنک تھا وہ بھی بغیر طوالت کے .....فطری طور انوپ سنگھ شریف، خوددار، مددگار، مخلص اور ہمدرد خصائل کا آدمی تھا۔ علاقے کا سب سے امیر آدمی ہو کر بھی اُسنے ندامت کا دامن بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا، ہر طرف آگ لگی۔ ہزاروں

لوگ مارے گئے، بستیاں جلائی گئی کتنے ہی لوگ بے گھر ہوئے۔ ادھر کے لوگ اُدھر گئے اور اُدھر کے لوگ ادھر آ گئے اپنی جان بچانے... سب کچھ چھوڑ کر.... کتنے ہی گھروں کے لوگ ایکدوسرے سے بچھڑ گئے جس کی جان بچی وہ نہتا.... ننگا..... بھوکا ..... خالی ہاتھ..... پھر ایک لکیر کھینچی گئی..... سرحد .....دھرتی کے دو ٹکڑے ہوئے.....ان ہی حالات میں انوپ سنگھ بھی اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنے بال بچوں کے ساتھ سرحد کے اس پار آیا۔ نہ وہ جاہ و حشمت، نہ وہ کاروبار، نہ وہ پہچان.... سب کچھ چھوڑ کر آیا۔ ایک مہاجر بن کر جسکو سر چھپانے کیلئے جگہ بھی مشکل سے ملی..... پھر کچھ وقت پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کیا..... اسی دوران اُس کی بیوی بھی مر گئی۔ اور کچھ وقت کے بعد وہ پیٹ پالنے کے لئے ایک پٹری پر میوہ فروخت کرنے لگا اور اب ایک چھوٹی سی دکان پر میوہ بیچتا ہے۔ شرافت، ایمانداری خلوص کے گُن اسکی وراثت ہیں۔ لیکن وہ چمکتا چہرہ۔ وہ مسکان وہ سب غائب.... مشکل سے گھر کا گزارہ ہوتا ہے لیکن ہمت کی داد دینی پڑیگی ان حالات میں بھی بچوں کی پڑھائی پر کوئی سمجھوتہ نہیں..... زندگی میں کتنی جلد سب کچھ بدل جاتا ہے .....یہیں پر انسان کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک ذہنی تناؤ میں مبتلا تھا اور لاشعوری باتیں کرتا تھا لیکن کبھی کبھی ایسی بات بھی اسکے منہ سے نکلتی کہ سُننے والا اُسکی دانائی اور شعور کا قائل ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر اپنے بیٹے کو

پاس بلا کر کہتا.....

''بیٹے.....ہم جس حال میں آج کل زندگی بسر کر رہے ہیں وہ یقیناً ناگفتہ حالت ہے۔ بڑی کٹھن ہے۔ دراصل اپنے صدیوں کے ٹھکانوں سے اکھڑ کر انسان ہر کہیں دُکھ جھیلتا ہے۔ جہاں دھوپ وہاں چھاؤں.....حالات ٹھیک ہونے دو.....دوملکوں کے درمیان تناؤ ضرور ختم ہوگا اور پھر ہم اپنے آبائی گاؤں بھی دیکھ کر آئینگے۔ سرحدوں کی بندشیں نرم ہو جائینگی۔ میں تمہیں اک راز کی بات بتاتا ہوں کہ جب ہم اپنی پرکھوں کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آئے۔ ہم نے اپنے ساتھ تھوڑے سے کپڑے ساتھ لائے۔ باقی وہیں چھوڑا.....کیا پتہ اسکا کیا ہوا ہوگا.....مگر میں نے اپنے آباو واجداد سے حاصل شدہ اپنے کمائے ہوئے لاکھوں روپیہ کی ملکیت کے سونے اور زیورات اور چاندی کے سکے وہاں مکان کے ایک کمرے میں زمین تلے دبا دئے ہیں۔ چار پانچ فٹ نیچے۔ کسی کو اس بارے میں خبر نہیں صرف میں جانتا ہوں۔ وقت قریب ہے کہ جب آر پار جانے کی اجازت دی جائے گی اور میں وہاں ضرور چلونگا تمہیں ساتھ لیکر پھر دکھاؤں گا اپنا گاؤں اپنا گھر.....اور وہ چھُپا ہوا خزانہ.....اسکو وہاں سے نکال کر ہی رہونگا۔ واپسی پر یہاں نیا مکان بنائینگے اور اچھا سا کاروبار شروع کرینگے۔ خوشیوں کے دن پھر لوٹ آئینگے۔''

انوپ سنگھ کا بیٹا یہ سب کچھ سُنتا تھا.....

''پتا جی .....ہم ضرور جائینگے.... کسی نہ کسی بہانے ضرور.....اپنا پرانا گاؤں، پرانا گھر....اور پھر وہ خزانہ''

''میری اک بات سن لے ابھی سرحدوں کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔''

انوپ سنگھ کہہ رہا تھا''ہاں بیٹا ہاں....تھوڑا صبر کر اور پھر دیکھ کس طرح ہمارا مقدر بدل جائے گا''۔

''لیکن پتا جی....ہمارا گاؤں اور گھر، یہ سرحد کے اُس پار کس جگہ پر ہیں.....''

''بیٹا....میں نے کہا نا صبر کر....میں تمہیں خود ساتھ لیکر دکھاؤنگا۔ اور ہاں میں نے کہا کہ میں نے جو خزانہ چُھپا کے رکھا ہے وہ میرے بغیر کوئی نہیں نکال سکتا ہے۔ اسکو میں نے کہاں کس جگہ چھپایا ہے صرف مجھے پتہ ہے.....''

دن گزرتے دیر نہیں لگتی....سال۔ دو سال اور تین سال گذر گئے اب انوپ سنگھ کا بیٹا کالج میں پڑھتا تھا.....وہ بھی اب ہمیشہ پتا جی کے خزانے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا....کب حالات ٹھیک ہونگے کب ہم سرحد کے اُس پار جاسکیں گے اور خزانہ نکل لیں گے.....اور ایک روز یہ خبر آئی کہ دو ملکوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے جسمیں وہ لوگ جو اپنے گھر

چھوڑ کر سرحد کے دوسری طرف رہ گئے ہیں اپنے گھروں یا گاؤں جا کر کچھ مقررہ وقت تک وہاں رک سکتے ہیں لیکن انکی شہریت اب اُسی ملک کی ہوگی جہاں وہ تقسیم کے بعد سٹل Settle ہوئے ہیں۔ اسکے لئے اُنہیں خاص قسم کا ویزا حاصل کرنا ہوگا۔ انوپ سنگھ کے بیٹے نے جب یہ خبر اپنے پتا کو سنائی وہ اتنا خوش ہوا کہ اسکی نیم مردہ زندگی میں نئی جان آ گئی۔

دوسرے دن سے ہی انوپ سنگھ نے ویزا حاصل کرنے کی تیاری شروع کی۔ دونوں باپ بیٹے مختلف دفتروں، پولیس تھانوں اور سفارت خانوں کے چکر لگاتے رہے اور چھ مہینے کے بعد انہیں یہ خصوصی ویزا ملا۔ اس دوڑ دھوپ میں کی وجہ سے تھکان میں انوپ سنگھ کی صحت بھی بگڑ گئی مگر چاہت... خوشی کی وجہ سے وہ چلتا رہا.....

''پتا جی اب ویزا بھی تیار ہوا اور دس پندہ دن کے بعد یہاں سے گاڑی اُس پار جانے والی ہے۔ اب سچی میں ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جائینگی، ہمارے دکھ دُور ہونگے ....'' بیٹا اپنے باپ کے ساتھ جیسے چمٹا ہوا تھا۔

''ہاں بیٹے ہاں ....اب ہمارے حالات ٹھیک ہو جائینگے۔ میری بات یاد رکھنا بیٹے کہ مقدر میں جو لکھا ہے وہی ملتا ہے، نہ وقت سے پہلے اور نہ مقدار سے زیادہ''۔ انوپ سنگھ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا..... ''بیٹے ....اب

سو جاؤ۔ میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں..... میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ آرام کرونگا تو ٹھیک ہو جاؤنگا۔''

صبح سویرے اٹھ کر بیٹا سیدھے اپنے باپ کے پاس گیا جو ابھی بستر پر لیٹا تھا۔

''پتاجی... کیا بات ہے۔ آپ ٹھیک ہیں نا''

''تھوڑا بخار ہے اور تھکان اور کچھ نہیں....'' انوپ سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی کہ اسکے منہ سے خون کی قے آ گئی.... بیٹے نے یہ سب دیکھ کر نزدیکی ہمسائے دوست کو بُلایا اور دونوں انوپ سنگھ کو آٹو میں بٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ یہاں اسے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا۔ ہسپتال میں موجود ڈاکٹر اور نرس نے جلدی جلدی اسکو کچھ انجکشن لگائے۔ اور بڑے ڈاکٹر کو مطلع کیا۔ بڑے ڈاکٹر نے انوپ سنگھ کا پوری طرح معاینہ کیا اور

''اس مریض کے ساتھ کون ہے'' ڈاکٹر نے پوچھا

''ڈاکٹر صاحب میں ہوں...''

''سنو.... اسکو برین ہیمریج ہوا ہے یہ ذہنی تناؤ کی ایک بیماری ہے جسمیں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے.... ابھی یہ خطرے کے اندر ہے..... میں دوائی لکھ دیتا ہوں وہ لاؤ....''

ہاتھ میں نسخہ لیا دوڑتے دوڑتے باہر میڈلکل شاپ پر گیا اور اسے

دوائی لے لی۔ دوائی رکھ کر اسنے کہا ''یہ لو دوائی۔ چار سو دس روپیہ''

''ابھی میرے پاس پیسے نہیں ۔ آپ دوائی دیدو میں بعد میں دونگا۔

''میڈیکل والے نے دوائی کونٹر سے واپس اٹھائی'' پہلے پیسے لاؤ پھر دوائی لے جاؤ۔''

''صاحب جی۔ مہربانی کر کے مجھے دوائی دیجئے ورنہ میرا باپ مر جائیگا۔ میں پیسے ضرور دونگا''

''سنو۔ ہم اگر ایسے ہی دوائی دیتے رہے تو چلی ہماری دکان...اگر دوائی ایسے ہی دیدی... بیمار مرجائے تو پیسے کون دیگا اور اگر ہم اُس وقت مانگیں گے بھی تو سب لوگ ملامت کرینگے اور کہینگے کہ ہم خودغرض، بے عار لوگ ہیں..... پیسے لاؤ اور دوائی لے جاؤ''

بیٹا واپس اندر ہسپتال میں گیا جہاں اسکا دوست انوپ سنگھ کے پاس تھا۔ اندر آکر دیکھا کہ ڈاکٹر نرس سب بیڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہیں

''یہ تو Acute brain hamerage '' کیس تھا۔ اس حالت میں بچنے کے چانسز کم ہوتے ہیں۔''

انوپ سنگھ کی آنکھیں کھلی نہیں لیکن رُوح پرواز کر چکی تھی۔ اُسکا بیٹا ہاتھ میں نسخہ لئے اپنے پتا کو تک رہا تھا.....اور فیصلہ۔۔۔!! ☆☆☆

بھالو

بھالو کا بچہ لوگوں کے مجمع کے درمیان آنکھوں سے آس پاس کا نظارہ کر رہا تھا۔ کافی تھکا ہوا تھا۔ لوگوں کی کافی تعداد اسکے ارد گرد جمع ہو گئی تھی تین گھنٹوں سے لوگ اسکا پیچھا کر رہے تھے۔ اب وہ تھک کر یہاں ٹھہرا تھا لیکن یہاں بھی لوگوں نے اُسے گھیر لیا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور پتھر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اس پر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے حملہ کیا۔ بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں تھا وہ درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

''دیکھو۔ ادھر بیٹھا ہے بھالو کا بچہ۔ کوئی خالی ہاتھ آگے نہ جائے، یہ حملہ کرنے کی تاک میں ہے۔'' کوئی شخص بلند آواز میں چلّا رہا تھا۔ لوگ عقب سے آگئے اور ایکدم بھالو کے بچے پر کلہاڑیوں سے وار کیا۔ وہ لہولہان ہو گیا۔ لڑکھڑا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا کسی اور نے لاٹھی سے حملہ کر کے اُسی

جگہ اُسے ڈھیر کیا۔ اب سبھی لوگ نزدیک آ گئے اور اس پر پتھر مارنے لگے اور ڈنڈے برسانے لگے۔ اسکی آنکھیں ابھی کھُلی تھیں جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ لوگوں نے اسے رسی سے باندھا اور پورے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا مردوزن، بچے بوڑھے تماشہ دیکھنے گھروں سے باہر نکلنے اور گلے مِل رہے تھے۔ بہت خوش تھے کہ بھالو کا بچہ مارا ہے۔

''آخر اس جنگلی بلا سے نجات ملی۔ شکُر ہے''

''ابھی کہاں نجات ملی۔ ابھی بھالو زندہ ہے۔ یہ تو اسکا بچہ ہے''

''چلو۔ آج یہ مارا گیا کل وہ بھی مارا جائیگا''

لوگ یہی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

''بھئی شکر ہے کہ یہ ہمارے شکنجے میں پھنس گیا ورنہ کیا معلوم کتنا جانی اور مالی نقصان کرتا''۔

''اچھا ہوا کہ بڑا ہونے سے پہلے ہی مارا گیا۔ لیکن اب ہمیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اسکی ماں ضرور اسے ڈھونڈنے نکلے گی۔ سُنا ہے کہ مادہ بھالو کو بچے سے زیادہ پیار ہوتا ہے اور اُسکی خاطر وہ اپنی جان بھی دے سکتی ہے''

''آنے دو اُسے بھی۔ بھالو اور اسکے بچے نے کتنا نقصان کیا ہے ہمارا۔ ہماری مکی کے کھیت اُجاڑ دیئے۔ جہاں کہیں پھل ہوتے ہیں انہیں

خراب کر دیتے ہیں.....انہوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا...اب بھالو آئے یا کوئی اور ہم اُسے سبق سکھائینگے۔'' جتنے منہ اتنی باتیں۔

میرا اس گاؤں میں گاہے بگاہے آنا جانا ہوتا تھا۔ میری بہن اِسی گاؤں میں رہتی تھی اور حال چال پوچھنے اور خبر گیری کیلئے مہینے دو مہینے بعد ضرور اس گاؤں میں بہن کے گھر آتا۔ اب جب سے ہاتھوں میں یہ موبائل فون آ گیا تو آنے جانے کا سلسلہ کم ہو گیا ہے اور روابط موبائل پر بات چیت تک ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا۔ اپنی اپنی رائے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ باتیں قریب آ گئیں اور دل دُور ہو گئے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ پچھلی بار جب میں یہاں بہن سے ملنے آیا تھا تو وہ بھالو کے بارے میں بتا رہی تھی کہ بھالو رات کے وقت کھیتوں میں آتا ہے اور کبھی کبھی گاؤں کے تالاب پر بھی۔ اندھیرا ہوتے ہی لوگ گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ عشاء اور فجر کی نماز تک اب لوگ گھروں میں ہی پڑھتے ہیں کوئی جرأت نہیں کرتا مسجد جانے کی۔ بھالو نے گاؤں والوں کا جینا حرام کیا ہے اور قافیہ تنگ کیا ہے۔

بہن کے گھر سے نکل کر جب میں اپنی گاڑی میں اپنے شہر کی طرف روانہ ہوا تو باہری سڑک پر ایک سفید ریش بزرگ نے ہاتھ ہلا کر مجھے روکا۔

''بیٹا۔ مجھے آگے تک جانا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟''

''بابا۔ آؤ''۔ میں نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ والی کھڑکی کھولی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

''خدا سلامت رکھے بیٹا تجھے۔ اس عمر میں آدمی چل بھی نہیں سکتا۔ مجبوری تھی ورنہ اس وقت کون گھر سے نکلتا۔ میری بیٹی اسی گاؤں میں رہتی ہے اُسی کے پاس آیا تھا۔ سُنا تھا کہ گاؤں میں بھالو نے کہرام مچایا ہے جبھی بیٹی کا حال پوچھنے آیا تھا۔'' بابا کہتے جا رہا تھا'' ویسے میرا اس گاؤں میں پچھلے پچاس ساٹھ سال سے آنا جانا ہے۔ ہمارے کچھ رشتہ دار بھی اس گاؤں میں رہتے ہیں اور انکے ہاں ہی بعد میں بیٹی بیاہی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تب اس گاؤں میں ندی کنارے دس بارہ کچے مکان تھے۔ ایک چھوٹی سی مسجد اور اسکے نزدیک ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان۔ آگے صرف جنگل ہی جنگل تھا۔ تب اس جنگل میں مختلف جنگلی جانور ہوتے تھے۔ شیر، بھالو، ہرن، گیدڑ، بندر.....اور جنگلی مرغابیاں بھی دیکھنے میں آتی تھیں۔ کہیں کوئی خوف وہراس نہیں تھا۔ جنگلی جانوروں کی اپنی دنیا اور اپنی زندگی اور گاؤں والوں کی اپنی دنیا اور اپنی زندگی۔ دونوں سکھ چین سے تھے۔ کسی سے کچھ لینا دینا ہی نہ تھا'' بیٹا شاید تم میری باتوں سے بُور ہو رہے ہو۔ میں کیا قصہ پارینہ سنانے بیٹھ گیا؟''

''بابا۔ میں بُور نہیں ہوا۔ آپ کی باتیں دلچسپ ہیں۔ بتائیں نا آگے''۔

'بیٹا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ سچ یہی ہے کہ اب اس گاؤں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسکی ذمہ داری گاؤں والوں پر عائید ہوتی ہے۔ انہوں نے جنگل کاٹ دئے۔ زمین ہموار کر کے اس پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ اسطرح جنگلی جانوروں کا گھر اُجاڑ کر اپنے گھر بنائے۔ دوسرے کا گھر اُجاڑ کر کون اپنے گھر میں خوش رہ سکتا ہے؟۔ وہ بے زبان جانور ہیں۔ کسے فریاد کریں؟۔ کہاں جائیں؟۔ کون انکی فریاد سُنے گا؟۔ انکا گھر گیا، انکے کھانے کیلئے بھی کچھ نہ رکھا۔ جنگل ہی ان کا گھر ہوتا ہے اور وہی سے وہ اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان کے جنگل پر انسانوں کا قبضہ ہے اور اس جنگل میں یا تو مکان بن گئے ہیں یا کھیت ہیں۔ اگر یہ جانور اپنے اجدادی گھر میں آتے ہیں کچھ کھا کر جاتے ہیں تو کونسا جرم کرتے ہیں۔ یہ تو اِنکی اپنی ملکیت ہے۔ گاؤں والوں نے تو قدرت کے بنائے ہوئے نقشے کو ہی بدل ڈالا ہے۔ جہاں کھلا میدان تھا اور لوگ دوڑ لگاتے تھے وہاں سرکاری دفتر بن گئے ہیں۔ تالاب سکڑ کے چھوٹا سا حوض بن کے رہ گیا ہے۔ ہر طرف پختہ اونچی اونچی عمارتیں۔ بیٹا ایک بات صاف ہے کہ ان لوگوں کو کبھی چین کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اشرف المخلوقات ہو کر بے زبان مخلوق پر اتنا ظلم۔''

''بابا۔ آپ صحیح اور درُست فرماتے ہیں'' میں نے بابا کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن بیٹا جب میں یہی باتیں کسی گاؤں والے کو بتاتا ہوں تو وہ اسکا بُرا مانتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری سوچ بھی دقیانوسی ہے۔ نئے زمانے کی ضروریات سے ناواقف ہوں۔ ترقی سے نا محرم ہوں اور میں بہکی بہکی باتیں کرتا ہوں.....'' اسکے بعد بابا باہر کی طرف جانب دیکھتے ہوئے بولا ''بیٹا۔ ذرا گاڑی روک لینا۔ میں تو اپنے گھر کے پاس پہنچا۔ آؤ بیٹا آج ہمارے پاس ٹھہرو۔''

''نہیں بابا۔ آج نہیں۔ گھر ضروری پہنچا ہے قسمت ہو تو پھر کبھی''۔

بابا دعائیں دیتے دیتے چل پڑا'' خدا تجھے سلامت رکھے خوش، رکھے، صحت عطا فرمائے اور عزت دے''۔

بابا کی باتوں نے میرے ذہن کے بند دریچے کھول دیئے۔ انسان بے زبان اور معصوم حیوانوں پر ظلم کر رہا ہے۔ اپنا ظلم اُسے دکھائی نہیں دیتا اور جب یہ حیوان ''اُف'' کرتے ہیں تو ایکدم آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ ان حیوانوں کو نا کردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے گھر پہنچ کر رات بھر میں یہی سوچتا رہا۔ نیند بھی اُڑ گئی۔

صبح ہوئی۔ میں چائے ہی پی رہے رہا تھا تو میری بہن کا فون

آیا ''بھیا۔کل آپ کیا آئے خوشی ساتھ لے کے آئے۔کل بھالو کا بچہ اور آج صبح بھالو مارا گیا۔ کہتے ہیں مادہ بھالو تھی۔ وہ اپنے بچے کو ڈھونڈنے نکلی تھی۔ گاؤں والوں کو معلوم تھا کہ وہ آئے گی، سبھی تاک میں تھے۔ جوں ہی وہ آئی اُسکا کام تمام کر دیا۔اب پورا گاؤں خوش ہے۔''

میں انگشت بدندان ہو کے رہ گیا۔کیسی خوشی.....

واہ رے اشرف المخلوق کئے جا ایسے ہی کارنامے۔

☆☆☆

کالی برف کالا کبوتر اور سفید کوا

''اتنا مہنگا۔ میں تو یہ بچپن میں چار آنے میں خریدتی تھی اور اب دو سو روپیہ۔ خدا خیر کرے۔ یہ تو قیامت صغریٰ ہے۔ ویسے بھی یہ دنیا کا وقتِ آخر ہے۔ قیامت قریب ہے۔ سُنا کہ کسی ملک میں کالی برف پڑی ہے۔ توبہ رے توبہ۔ کبوتر بھی اب کالے میں اور سب ایک نشانی باقی ہے کہ قیامت آنے سے پہلے کالا کوا سفید ہوگا''

چاندی کی طرح سفید بالوں والی چھوٹے سے قد کی بڑھیا جگر دیدی دکاندار سے کہہ رہی تھی میں دو دن پہلے اس گاؤں میں اپنے ایک دوست کے گھر آیا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور اچانک برفباری ہوئی تھی۔ شہر کو جانے والے راستے بند ہو گئے اور میں اس طرح واپس گھر نہ جاسکا۔ اب برفباری رک گئی تھی اور میں کمرے میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا تھا جبھی کمرے سے باہر نکلا تھا۔ گاؤں میں بس ایک دکان تھی جس میں گاؤں کی ہر اشیاء ضرورت دستیاب تھی۔ کوالٹی کا پتہ نہیں اور نہ ہی دام کا۔ دکاندار بھی اپنی مرضی سے دکانداری کرتا تھا۔ چیزوں کے بیچنے کا اسکا انداز بھی عجیب تھا... نیوٹری کو وہ یہ کہہ کر گاؤں والوں کو بھیجتا تھا کہ یہ سوکھا ہوا گوشت

ہے جو عرب سے آتا ہے اور عید قربان پر جمع شدہ قربانی کے گوشت کو سکھا کر پیک کیا جاتا ہے۔ پورے گاؤں والے اس کو عرب اور قربانی کا گوشت سمجھ کر برکت اور متبرک رزق سمجھ کر ہی خریدتے تھے۔ کون ان گاؤں والوں کو سمجھاتا کہ یہ دالوں کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گولے ہیں۔ خیر دکاندار تو گاؤں کا سرپنچ تھا اور بڑا چالاک تھا۔ باتیں بنانا جانتا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ باتوں میں اُسے جیت سکتا۔

شاید کسی چیز کو خریدنے کے لئے یہ بڑھیا اُس دکان پہ گئی تھی اور دکاندار نے کچھ زیادہ ہی دام بتائے تھے۔ پورے گاؤں میں ایک دکان، شہر کا راستہ بند، ہر طرف برف اور خریدنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ دکاندار کی چاندنی اور خریدار کی شامت۔ اسی وجہ سے بڑھیا چڑ گئی تھی اور ایسا بولنے لگی تھی۔

میں بڑھیا کے نزدیک گیا اور پوچھا

''دادی.... کیا بات ہے تم یہ قیامت قیامت کی کیا بات کر رہی ہو''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا'' گاؤں کے لگتے نہیں ہو۔ شہر سے آئے ہو۔ کس کے ہاں ٹھہرے ہو؟....'' ایک ہی لمحہ اسنے مجھ سے کئی سوالات کئے۔

دادی ..... میں شہر سے ہی آیا ہوں اور یہاں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوں''

''تم کیا جانو گے پھر...تم تو شہری ہو اور ہم دیہاتی۔''

''نہیں دادی....ایسی بات نہیں''۔

''بیٹا یہ دکاندار ہمیں ہر چیز کے دام بڑھا کر دیتا ہے۔ ہماری مجبوری کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔مگر ہم کیا کریں۔قصور اسکا ہے نہ ہمارا.... پرانے لوگوں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ قیامت جب نزدیک آئے گی تو ایسا ہی ہوگا۔ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔اسی لئے بھڑک اٹھی تھی...''

''لیکن دادی....یہ کالی برف ، کالے کبوتر ،سفید کوا....یہ کیا کہہ رہی تھی آپ''

''بیٹا....یہ تو دانا لوگوں کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ سچی اور سولہ آنے پکی۔دنیا ختم ہونے کے وقت یعنی قیامت جب آنے والی ہو تب سفید کے بجائے کالی برف پڑے گی کبوتر کالے رنگ کے ہونگے اور کوے سفید رنگ کے دکھائی دینگے۔یہ سب قدرت کے کرشمے ہونگے اور قیامت کی نشانیاں ...میں نے اپنی آنکھوں سے پچھلے سال ایک رشتہ دار کے گھر کالے کبوتر دیکھے ہیں اور ابھی کل ہی سُنا کہ کہیں کسی ملک میں کالی برف پڑی ہے گویا دو نشانیاں تو پوری ہوگئی اور اب صرف سفید کوا دیکھنا باقی ہے تو پھر سب ختم.....''

اس بڑھیا کی باتوں سے مجھے ہنسی آرہی تھی۔اتنی عمر گزاری ہے لیکن ابھی حقیقت سے ناواقف...سُنی سنائی باتوں پر یقین...کون اسکو سمجھاتا

کہ کبوتر سفید بھی ہوتے ہیں اور کالے بھی...اُسنے عمر بھر سفید کبوتر دیکھے ہونگے اور دل دماغ میں بات بیٹھ گئی کہ کبوتر صرف سفید ہوتے ہیں ۔کبوتروں کی ایک خاص قسم ''چری'' تو سیاہ رنگ کے ہی ہوتے ہیں لیکن بڑھیا نے تو پہلی بار پچھلے سال دیکھے ہیں اسی لئے ایسا کہہ رہی ہیں۔ رہی بات کالی برف کی.... یہ تو اس نے سُنا کہ کسی جگہ سیاہ رنگ کی برف گری ہے لیکن یہ اُسے معلوم نہیں کہ دراصل اس برف کا رنگ سیاہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ عراق میں ہتھیاروں سے جو لڑائی پچھلے سال لڑی جارہی تھی اس کے کالے ذرات موجود تھے جو اس برف سے مل گئے اور اسکو کالا بنادیا۔اور رہی بات سفید کوے کی...ایک ناممکن اور مہمل بات.....

بڑھیا کی باتیں سن کر میں واپس اپنے دوست کے گھر گیا۔ میں نے اپنے دوست اور اسکے گھر والوں کو بڑھیا کی باتیں سنادیں۔اُنہوں نے بغور میری بات سنی لیکن میری اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ بڑھیا سُنی سنائی اور بے بنیاد باتوں پر یقین کر بیٹھی ہے اور بہت ہی ناسمجھ اور نادان ہے اس معاملے میں میرے دوست کے والدین کا کہنا تھا کہ یہ بڑھیا بڑی سیانی ہے، سمجھدار ہے اور کوئی فضول بات نہیں کرتی۔ابھی رات کے نو بجنے کا وقت اور ہم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔

''اُف....دیکھو لائٹ چلی گئی۔ ویسے بھی یہاں بجلی کم ہی رہتی

ہے۔ اسکا ٹھکانہ شہر میں ہے اور وہاں زیادہ تر حکمرانوں اور افسروں کے گھروں میں ....اب کی بار معلوم نہیں کتنے دن کے لئے لائٹ چلی گئی''۔ میرے دوست کے والدین نے کہا۔

''کیوں انکل...لائٹ تو آئے گی نا....یہ دنوں کی بات''۔

''بیٹے ... یہاں تھوڑی سی برفباری ہو جائے ، ہوا ذرا تیز چلے تو بجلی بند کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے محکمہ بجلی کو''

ہم نے لالٹین اور موم بتی کی روشنی میں کھانا کھایا اور پھر جلدی اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے۔ سردی بھی تھی ، لائٹ بھی نہیں ، اور کوئی دوسرا کام بھی نہیں۔

صبح سویرے جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سفید روشنی کھڑکی میں لگے شیشوں سے چھن کر آرہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی۔ باری برفباری ہو رہی تھی اور دور اخروٹ کے درخت کی ایک شاخ میں ایک سفید جانور بیٹھا تھا۔ میں اس جانور کو دیکھتا رہا اور چند لمحوں کے بعد اُس نے اپنے جسم کو حرکت دی اور اس پر جمع ہوئی برف نیچے گر گئی۔ اور دیکھا کہ دراصل کوے پر برف پڑی تھی اور وہ سفید دکھائی دے رہا.....سفید کوا....شاید بڑھیا نے بھی دیکھا ہوگا....

☆☆☆

بارہ ٹیلے

میرا تبادلہ اپنے آبائی شہر سے بہت دُور ایک پہاڑی علاقے میں ہوا تھا اور وہاں سے آنے جانے کے وسائل محدود تھے۔ یہ علاقہ بیشتر وقت دوسرے علاقوں سے منقطع رہتا تھا۔ میرا یہ تبادلہ اچانک اور قبل از وقت ہوا تھا۔ اسکے بارے میں تو میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا، تبادلہ اور وہ بھی ایسی جگہ۔ مگر کیا کرتا، نوکری تو نوکری ہوتی ہے، حکم تو حکم ہوتا ہے اور وہ خاص کر ہم جیسے بے وسیلہ لوگوں کیلئے جو نہ سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، نہ سیاستدانوں حکمرانوں سے رشتہ اور نہ امورِ دنیا سے واقف ہوتے ہیں۔ مجھے اس بات پر دُکھ نہیں تھا کہ میرا تبادلہ ہوا تھا، بلکہ مجھے دکھ اس بات پر تھا کہ کئی برسوں سے مجھے جسکی تلاش تھی، جسے میں ملنا چاہتا تھا وہ صرف چند ماہ پہلے مجھے اپنے آبائی شہر میں ملی تھی۔ سوچا تھا مل کر اب پہروں باتیں کرینگے، ایکدوسرے کا غم ہلکا کرینگے۔ وہ بھی بہت خوش تھی اور بڑی امیدیں لگائی تھیں ہمارے اِس ملن کے ساتھ۔ مگر..... میرا یہ تبادلہ ہم دونوں کیلئے کسی آندھی یا طوفان سے کم نہ تھا۔

جب وہ مجھ سے ملنے آئی تو مجھے معلوم تھا کہ اسکو میری ٹرانسفر کا پتہ چل چکا ہے۔ میں نے اسکے چہرے پہ اُداسی کے سائے دیکھے۔

''کیسی ہو؟ ٹھیک ہو نا؟ کیا حال ہے؟'' میں نے حال چال پوچھا ''حال تو تم دیکھ رہے ہو۔ بڑی مشکل سے برسوں بعد ملے تھے اور اب پھر.....'' اسکے لہجے میں اُداسی تھی۔

''دو سال کی ہی بات ہے۔ اس دوران بھی کم از کم ایک دو بار ضرور گھر آؤ نگا۔ اس طرح ملتے رہینگے۔ اب ہمیں کوئی جُدا نہیں کرسکتا''۔ میں نے دلاسہ دیکر سمجھانے کی کوشش کی۔

''دو سال.....اتنا لمبا عرصہ....میرے لئے دو دن بھی قیامت سے کم نہیں اور تو اور کل کس نے دیکھا ہے۔ زندگی کا بھروسہ کیا اور پھر.....'' میں نے اسکی بات بیچ میں کاٹ دی اور اسے بھروسہ دینے لگا

''تم تو پڑھی لکھی ہو۔ جانتی ہو کہ ناامیدی کفر ہے۔ جس رُب نے اتنے برسوں بعد ہمیں ملایا کیا وہ پھر نہیں ملا سکتا۔ وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ یاد ہے نا کہ کتنے برس پہلے ہم بچھڑ چکے تھے اور پھر ملے۔ بھروسہ رکھو سب ٹھیک ہوگا۔ اچھا چھوڑو یہ اُداسی.....اب بتاؤ جس جگہ میں جا رہا ہوں وہاں سے تمہارے لئے کیا لاؤں...''

اس نے مجھ پر ایک لمبی نگاہ ڈالی ''جب وہاں پہنچ جاؤ گے تو فون کرنا، بتاؤ نگی'' اسکی آنکھوں سے موتی کے مانند آنسو کے قطرے ٹپک پڑے اور چل پڑی۔

دوسرے دن میں نے جانے کی تیاری کی اور دو دن کے کھٹن اور تکلیف دہ سفر کے بعد اس جگہ پہنچا جہاں میرا تبادلہ ہوا تھا۔ کہنے کو یہ ایک پہاڑی ضلع کا ہیڈ کوارٹر تھا مگر اصل میں کچھ اور۔ دشوار، پہاڑی سڑکوں کے سفر کے بعد یہ علاقے سرحد کے بالکل پاس تھا۔ نہ تو میں اِس سے پہلے اس جگہ آیا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ واقفیت تھی۔ یہاں کے رہنے والے اس کو شہر کہتے تھے جبکہ مجھے یہ ایک چھوٹا سا ٹاون لگا جہاں ان سہولیات کا بھی فقدان تھا جو کسی ٹاون میں ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ساٹھ ستر سال پہلے یہاں ایک راجہ حکومت کرتا تھا جسکی یہ خود مختار سٹیٹ تھی اور تب یہ علاقہ کافی ترقی یافتہ تھا لیکن بعد تقسیم ملک کے دوران یہ سٹیٹ بھی بٹ گئی اور تین جنگوں کے دوران تباہ و برباد ہوگئی۔ اب حالت یہ تھی کہ بجلی برائے نام کی، صبح دو گھنٹے اور شام دو گھنٹے۔ ہر شعبہ کا یہی حال۔ سیر و تفریح کیلئے کچھ بھی نہیں... دو پارکیں جنکی حالت بھی ناگفتہ دہ۔ لوگوں مفلسی کے شکار اور بہت سارے لوگ مزدوری کرنے باہری ملکوں میں جاتے تھے اور وہاں چار پانچ سال مزدوری کر کے تھوڑی پونجی لا کر یہاں گزارہ کرتے۔ مگر ہر جگہ اور ہر موڑ پر مندر، مسجد، گورو دوارے، زیارتیں، استھان، درگاہیں اور دینی ادارے دارالعلوم موجود تھے۔ بازار میں مشکل سے کتابوں کی کوئی دکان تھی۔ خیر جب میں بس اڈے پر پہنچا تو دفتر والوں نے ایک ملازم کو مجھے رسیو

کرنے کیلئے بھیجا تھا۔

''سر.....'' یہ کہکر ایک نوجوان میری طرف آیا اور میرا بریف کیس ہاتھوں میں لیکر کہنے لگا

''سر۔ میں آپکا ایک سب آرڈنیٹ ہوں۔ چلئے سر یہاں اس راستے سے چلنا ہے''۔

بارش ہو رہی تھی اور میں تھک گیا تھا۔

''ارے بھئی....کوئی آٹو وغیرہ نہیں ملیگا'' میں نے اُس سے پوچھا

''سر.....جہاں ہمیں جانا ہے وہ راستہ سیڑھیوں سے جاتا ہے وہاں آٹو نہیں جاتا اور یہاں آٹو مشکل سے ہی ملتا ہے'' اسنے جواب دیا

''اچھا'' میں نے کہا

''آہو'' وہ بولا

اُس وقت میں ''آہو'' کا مطلب نہیں سمجھا تھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اسکا مطلب ''ہاں'' ہے۔

کوارٹر پر پہنچ کر میں نے چائے پی لی اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس کوارٹر میں میرے دوسرے ساتھی جو پہلے ہی یہاں کام کر رہا تھا نے شام کا کھانا تیار کر دیا تھا۔ شام دیر گئے اس نے مجھے جگایا اور میں نے کھانا کھا لیا

اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات بھی ڈھل چکی تھی۔ آسمان کے ستارے بھی کچھ تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔ ہر طرف مکمل سکوت اور خاموشی تھی۔ میں نے موبائل نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو....'' اُسنے فون اٹھایا۔

''ہاں...ہیلو....میں ٹھیک طرح یہاں پہنچا....تم ٹھیک ہونا'' میں نے پوچھا۔

''اپنا خیال رکھنا....'' بھرائی ہوئی آواز میں اسنے کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔

''ارے۔ کیا ہوا تجھے....تم ٹھیک تو ہونا۔'' میں بات ہی کر رہا تھا کہ فون کٹ گیا۔ اس علاقے سے فون بھی مشکل سے لگتا تھا اور اکثر نیٹ ورک نہیں چلتا تھا۔

دوسرے دن جب میں آفس گیا تو اپنے دوسرے ساتھیوں سے تعارف ہونے کے بعد میں نے بارہا اُسے فون لگانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آفس سے واپس آنے کے بعد جب میں نے فون لگایا تو یکدم لگ گیا۔ اور وہ وہاں سے بولی

''ہیلو۔ ٹھیک ہونا۔ سُنا وہاں کھانے کی وہ چیزیں نہیں ملتیں جن

کے تم عادی ہو۔ موسم بھی نا موافق ہے اور اکثر سرحد پر گولہ باری ہوتی ہے۔ پلیز.... اپنا خیال رکھنا....'' اُسنے دو ہی دن میں اس علاقے کے بارے میں کہیں سے ساری جانکاری حاصل کی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں ۔ اپنا خیال بھی رکھوں گا۔ میں کیا چھوٹا بچہ ہوں۔ گھر سے باہر پہلی بار تو نہیں نکل رہا ہوں۔'' میں نے کہا

''ہاں..... مجھے سب پتہ ہے۔ میری قسم ہے کہ اپنا خیال رکھنا....''

''کہا نا رکھوں گا... اچھا اب بتاؤ تمہارے لئے میں یہاں سے کیا لاؤں میں نے پوچھا

''مجھے... تیرے بغیر کیا چاہئے'' اسنے جواب دیا

''پھر بھی.... تم نے بتایا تھا کہ فون پر بتاؤنگی''

''سُنا ہے کہ وہاں بارہ ٹیلے ہیں ۔ ان کے بارے میں مجھے بتانا....''

ویسے مجھے وہاں کوئی ٹیلہ نظر نہیں آیا پھر بھی میں ہر دوسرے روز کسی نہ کسی سے ان ٹیلوں کے بارے میں پوچھتا تھا مگر کسی پاس جواب نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ میں نے یہی غلط سُنا ہے اور کچھ اپنی لاعملی کا اظہار کر رہے تھے۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی .... دن گزرے، مہینے گذرے اور ایک

سال گذر گیا اور ایکدن میں دفتر سے واپس آرہا تھا اور میرے آگے دو مقامی مزدور کاندھوں پر گیس سلینڈر لئے چل رہے تھے۔ ان میں ایک نے دوسرے سے کہا

''تو کدھر چلیا''

''میں اگلے ٹیلہ پر چلیا جتھاڈی سی آفس کا موڑ ہے۔ تو کدھر چلیا''

''میں پریڈ گراونڈ پر چلیا''

انکی باتیں سنکر میں ذرا تیز چلا اور انکے نزدیک پہنچ کر اُن سے پوچھا۔

''ارے بھئی۔ تم جو یہ ٹیلے والی بات کر رہے تھے یہاں کیا کوئی ٹیلہ ہے؟''

''آہو۔ اِس شہر وچ کافی ساری جگہ ایسیاں ہیں جدھر بستی ہیں وہ سب ٹیلے ہیں۔'' ان میں اک مزدور نے بتایا

''کتنے ٹیلے ہیں یہاں اور کہاں کہاں پر ہیں وہ؟'' میں نے پھر پوچھا

''صاحب جی۔ اِسی اتھے تری سال وچ کام کرسیاں۔ اُن اتھاہ کافی لوگ بنسیں۔ کافی آبادی پھیل گئی اور اب ٹیلہ نظر نہیں آتی۔ اسا اتنا پتہ

ہے کہ یہ بارہ ٹیلے ہیں اِک کھوڑی ناڑ، دوجا اعلیٰ پر، تیجا پرانا شہر....'' اس طرح ان مزدوروں نے مجھے پورے بارہ ٹیلوں کے نام بتائے اور نشاندہی بھی کی۔ میں نے انکا شکریہ ادا کیا اور اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

میں بڑا خوش تھا کہ میں ان بارہ ٹیلوں کی حقیقت جان گیا۔ ایسا لگا جیسے کوئی عظیم کارنامہ انجام دیا ہو۔ رات دیر گئے میں نے اپنا موبائیل اٹھایا اور آرام سے فون لگایا تاکہ بارہ ٹیلے کے سوال کا جواب میں اُسے بتاؤں۔ کافی کوشش کی مگر فون نہیں لگا۔ دیر رات میں کوشش کرتا مگر بے سود۔ صبح ہوئی تو فون لگانے کی پھر کوشش کی مگر فون Out of reach آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ تین دن بعد میں نے آفس سے چھٹی لے لی اور اپنے آبائی گھر آ گیا۔ پتہ چلا کہ وہ کہیں گئی ہے کہاں کسی کو پتہ نہیں تھا اور میں.....میں تو کسی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا دل دماغ منجمد ہو گیا اور پھر وہی تلاش پھر وہی معمہ.... پرانی یادوں کے حصار سے باہر نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے یہ جان کر بھی کہ ماضی سے جڑے رہنے سے نہ حال سنورتا ہے نہ مستقبل بنتا ہے۔ مگر اک بات ضرور ہے کہ ہر ایک کو اپنے حصے کا سکھ چھین کر لینا پڑتا ہے۔ خوشیوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ مسرتوں کی حد بندی نہیں کی جاسکتی ہے۔ جسکا جتنا ظرف ہوتا ہے اُسی کے مطابق اُسے خوشیاں اور غم ملتے ہیں۔ مگر یادیں ہمیشہ ساتھ رہ جاتی ہے اور وہ بھی عذاب بن کے۔

معصوم

سڑک پر بہت ساری چھوٹی بڑی گاڑیاں رُکی تھیں۔ میں نے بھی اپنی گاڑی روک دی۔ باہر نکلا اور روڈ پر کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔

''بھائی صاحب۔ یہ گاڑیاں کیوں رُکی ہیں۔ کوئی ایکسڈنٹ تو نہیں ہوا ہے؟''

''کہتے ہیں کہ صبح سے ہی ٹریفک بند ہے علاقے کے کالج اور سکول جانے والے کچھ لڑکوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کیں ہیں۔ کسی بھی گاڑی کو آگے جانے نہیں دیتے۔ حتا کہ ایک ایمبولینس گاڑی کو بھی نہیں چھوڑا اور اسے واپس جانا پڑا۔'' اُس آدمی نے بتایا

''مگر بات کیا ہے۔ کس بات پر رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ کوئی تو وجہ ہوگی۔''

''کیا بتائیں۔ مختلف لوگ، مختلف باتیں بتاتے ہیں۔ جتنے مُنہ

اتنی باتیں۔کوئی کہتا ہے کہ پولیس نے کل کسی لڑکے کو گرفتار کیا ہے اور اسی پر بوال ہے کوئی کہتا ہے کہ پولیس نے کچھ لڑکوں کی مار پیٹ کی ہے۔کوئی کہہ رہا تھا کہ مسافر گاڑی والوں کیساتھ کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

میں تھوڑا آگے چلا تا کہ معلوم ہو سکے کہ اصلیت کیا ہے۔معلوم ہوا کہ علاقے سے تعلق رکھنے والے سکول اور کالج جانے والے لڑکے اور لڑکیوں کو یہاں سے گذرنے والی مسافر بسیں نہیں بٹھاتیں۔گاڑی والی کا کہنا تھا کہ یہ طلباء اور طالبات انہیں کرایہ ہی نہیں دیتے اور اگر دیتے بھی تو وہ بھی آدھا۔انہیں پورا کرایہ دینے والے مسافروں کو چھوڑ کر ان کو بٹھانا پڑتا ہے۔دوسری طرف طالبات اور طلبا کا کہنا ہے کہ قانونی طور انہیں آدھے کرایہ پر انہیں گاڑی میں سفر کرنا ہے۔مسافر گاڑیوں نے گزشتہ دن کسی بھی طالب علم کو گاڑی میں نہیں بٹھایا تھا جس وجہ سے کل علاقے کا کوئی بھی لڑکا یا لڑکی سکول یا کالج نہ جا سکے۔اور آج انہوں نے احتجاجاً پورا ٹریفک بند رکھا۔

''ویسے تو طلباء طالبات کا پروٹسٹ جائز ہے۔سرکار کی طرف سے تو باضابطہ ایک حکم نامہ اجراء ہوا ہے جسکے تحت مسافر گاڑیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ سکول جانے والے طباء طالبات کو کرایہ میں پچاس فیصد یہ رعایت دیدے اس طرح اُن کا یہ حق ہے اور ٹرانسپورٹروں کی طرف سے یہ سراسر

زیادتی ہے'' سڑک پر موجود چند لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''صاحب جی۔ سرکار کا حکم ہے مگر سرکار کو یہ بھی دیکھنا اور سمجھنا چاہے کہ ڈرائیور یا کنڈیکٹر کی اپنی گاڑی ہوتی نہیں۔ انہیں تو ہر شام اپنے مالک کو حساب دینا ہوتا ہے اور مالک کو گاڑی کی آمدن سیٹوں کی تعداد اور روٹ کے مطابق ہی لینی ہوتی ہے اور تو اور یہ بھی ماننا ہوگا کہ مالک بھی لاکھوں روپیوں میں خریدی گاڑی اس لئے چلا رہا ہے کہ کچھ کمائے۔ اور پھر بنک کی قسط اور سود یہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ ہم جب کسی بس سٹاپ پر رُکتے ہیں تو اتنے لڑکے اور لڑکیاں گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں کہ پوری بس بُک ہو جاتی ہے اور دیگر مسافروں کو سٹاپ پر ہی چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس طرح پورا کرایہ دینے والا باہر اور آدھا کرایہ دینا والا اندر۔ پھر یہ طلباء و طالبات نت نئے بہانے بنا کر کرایہ نہیں دیتے۔ کوئی گھر میں پیسہ بھول گیا، کسی کے پاس پیسہ نہیں ..... اور جو دیتے ہیں وہ بھی ہاف۔ اس طرح ہماری کمائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ مشکل سے تیل کا خرچہ نکلتا ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں ہم کیا کریں۔ انکو گاڑی میں بٹھا کر سکول سے گھر اور گھر سے سکول پہنچائیں اور خود خالی پیٹ رہیں یا پھر گھر بیٹھیں ..... ہم بھی بال بچے والے ہیں۔ یہ ہماری روٹی روزی کا سوال ہے''۔

یہ شخص کوئی ڈرائیور یا کنڈیکٹر تھا جو یہ مجھے بتا رہا تھا۔ ویسے اسکی

باتوں میں تھوڑا وزن تو ضرور تھا۔ اسکی باتیں سُن کر میں خاموش ہو گیا۔ ویسے بھی میں کسی بحث مباحثے میں اُلجھتا نہیں اور میرے پاس کوئی دوسری معقول دلیل بھی نہیں تھی۔

دفتر پہنچے میں اب بہت دیر ہو رہی تھی۔ ویسے آج مجھے گھر سے بھی نکلنے میں دیر ہو ہی گئی تھی۔ دراصل جب میں نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تو دُور کا ایک رشتہ دار آ ٹپکا تھا۔ اِس سے پہلے وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آیا تھا مگر آج کسی کام سے آیا تھا۔ ویسے بھی ایسا کبھی کبھی ہوتا ہی رہتا ہے کہ لوگ تبھی گھر آجاتے ہیں جب دفتر جانے کی تیاری ہو رہی ہوتی ہے۔ نہ معلوم کیوں۔ مگر دنیا داری تو نبھانی پڑتی ہے اور کچھ قرابت کا خیال بھی اور توقعات بھی میری بیگم کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ جب وہ آفس نکلنے لگتی ہے تو کوئی نہ کوئی مہمان آ ٹپکتا ہے۔ اُن گھروں کے ساتھ یہ ایک سنگین مسلۂ جہاں دونوں میاں بیوی نوکری کرتے ہوں۔ ان بن بلائے مہمانوں کا بھی ویسے کوئی قصور نہیں۔ انکو ہم سے ملنا ہو تو یہی وقت ہوتا ہے جب ہم گھر میں ہوتے ہیں ورنہ پورے دن گھر کا باہری گیٹ بند ہی رہتا اور بیان کرتا ہے کہ گھر میں کوئی نہیں۔ معلوم نہیں کس کو نیوکلیس فیملی (Nucleus family) کا خیال ذہن میں آیا۔ اس میں جتنی خوبیاں ہیں اُسے کئی گنا پریشانیاں ہیں لیکن کیا کریں۔ آج کل دلہن شادی کے دن ہی علیحدہ گھر کے لئے پوری

تیاری کر کے آتی ہے اور پورا گھریلو سامان لاتی ہے۔ خیر آج دن ہی کچھ ایسا ہے۔ صبح سے سب کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔

اس روڈ سے میرا پچھلے ایک سال سے لگاتار آنا جانا تھا۔ اور جب بھی اس روڈ سے میری گاڑی گزرتی تو رستے میں بہت سارے طلباء اور طالبات کو ہاتھ ہلا کر گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرتے دیکھتا تھا تا کہ انکو لفٹ ملے۔ پچھلی بار جب برسات کا موسم تھا اور بہت بارش ہو رہی تھی میں اپنی گاڑی لیکر اسی رستے سے آفس جا رہا تھا تو ایک معصوم سا چہرہ، بارہ، تیرہ سال کا ایک لڑکا سڑک پر کھڑا بارش سے بھیگا ہوا ہر گاڑی والے کو لفٹ دینے کیلئے ہاتھ ہلا رہا تھا مگر..... میں نے جب اُسے دیکھا تو گاڑی روک دی اور اسے اپنی گاڑی میں اٹھایا۔ اس واقعہ کے بعد بہت بار یہ لڑکا میری گاڑی دیکھکر ایکدم ہاتھ ہلاتا اور اپنا چہرہ مجھے دکھاتا۔ میں رُک جاتا اور اسے لفٹ دیتا۔ چھٹی کلاس کا یہ طالب علم بہت کم باتیں کرتا تھا اور چہرے کی معصومیت سے اسکی شرافت جھلکتی تھی۔ اسکا نام بھی معصوم تھا۔ لیکن آج۔ آج یہ لڑکا کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میری نظریں اسکو ڈھونڈ رہی تھیں تا کہ وہ مجھے ملے اور میری کچھ مدد کرے یہاں سے نکلنے میں۔ اسی دوران میرا موبائل بجنے لگا۔ دیکھا تو آفس سے فون تھا۔

''سر۔ آپ کہاں ہو۔ بڑے سر آئے ہوئے ہیں اور آپکا پوچھ

رہے ہیں.....''

''ارے بھئی میں رستے میں پھنسا ہوں۔ کچھ لڑکوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کی ہیں تین چار گھنٹوں سے سارا ٹریفک رُکا ہوا ہے.....'' میں نے آفس کے بابو سے کہا۔

''لیکن۔ بڑے سر غصے میں ہیں۔ کچھ کیجئے اور جلدی آجائے۔ تب تک میں انہیں چائے پانی پلاتا ہُوں...'' اسنے بولا

اب پریشانی اور بڑھ گئی۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک سائیڈ سے نکال دی۔ نزدیکی لنک روڈ پر چلنے لگا جہاں کوئی ممکنہ متبادل رستہ ملتا۔ جوں ہی میری گاڑی آگے بڑی تو چند لڑکے تھوڑی دوری پر نمودار ہوئے جن کے ہاتھوں میں پتھر اور لاٹھیاں تھیں۔ میری نظر ایکدم معصوم پر پڑی جسکی مجھے تلاش تھی۔ جونہی اس کی طرف مسکان بھری نظر ڈالی اُسنے اپنے ہاتھ میں رکھا پتھر میری گاڑی پر مارا اور میری گاڑی کا فرنٹ شیشہ ٹوٹ گیا اور میں.....

☆☆☆

کُتّا

فروری کی شام مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جاڑے کا موسم تھا لیکن برف کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ اگر چہ یہ برفباری کا موسم ہوتا ہے لیکن موسم میں غیر معمولی تغیر وتبدیل کا اثر تھا کہ دن میں کھلی دھوپ تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ڈاکٹر اقبال کی کلیات پڑھ رہا تھا۔ گھر میں آج کوئی اور نہیں تھا۔ بیگم بچوں سمیت میکے گئی تھی اور میں گھر کی رکھوالی کیلئے گھر پر ٹھہرا تھا۔ ہماری کالونی میں اُس وقت خاموش سناٹا تھا کیونکہ اب تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے چکے تھے اور سبھی لوگ خراٹے لے رہے تھے۔ شاید میں ایک اکیلا بندہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔ باہر سے مجھے گیٹ کھولنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دیدی۔ میں نے آہستہ سے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ ہمارے مکان کے سامنے سڑک کے دوسری طرف شبن جی کے گھر کے سامنے ایک ٹرک کھڑا ہے اور شبن جی، اسکی بیوی ریتا اور دو بیٹے اس ٹرک میں بوریوں میں باندھا

کچھ سامان لادرہے ہیں۔ میں نے کھڑکی بند کی اور گھر سے باہر نکل کر شبن جی کے پاس گیا اور پوچھا

''شبن جی۔ کیا بات ہے۔ یہ سامان یہ ٹرک.....''

''بھئی ۔ آپ کو پتہ ہے کہ حالات بہت تیزی سے بگڑتے جارہے ہیں اور ان حالات میں نہ گھر کے باہر نہ گھر اندر آدمی محفوظ ہے۔ مناسب یہی سمجھا کہ یہاں سے نکل ہی جائیں''۔ شبن جی نے آہستہ آہستہ دھیمی زبان میں جواب دیا

''لیکن ۔ ہم سب تو اِدھر رہتے ہیں۔ ہماری کالونی میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی مل جل کر رہے ہیں۔ حالات خراب ہیں تو سب کیلئے۔ سب مل کر ان حالات میں جی لیں گے۔ اکٹھے جئیں گے اور مرنا ہو تو اکٹھے مرینگے... یہاں کوئی اکیلا نہیں ہم سب ایکدوسرے کے ساتھی ہیں...'' میں نے شُبن جی سے کہا۔

''بھئی ابھی تک تو ہم بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں مگر کل کا کیا پتہ۔'' شُبن جی یہ کہکر میرے قریب آیا اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا ''بھئی۔ تم تو میرے بچپن کے ساتھی ہو۔ تمہارے اور ہمارے گھر کے تعلقات اتنے قریب ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتے۔ تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ کل تک میں بھی وہی سوچتا تھا جو تم کہہ رہے ہو مگر آج صبح ہی ہمیں خاص

ذرائع سے اطلاع ملے ہے کہ بہت جلد یہاں کے حالات کافی خراب ہونے والے ہیں۔ بہت خون خرابہ ہونے والا ہے۔ ہمیں فی الحال یہاں سے جانے کی صلاح دی گئی ہے....'' اسکی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''اگر ایسا ہے تو ہمیں یہ اطلاع کیوں نہیں دی گئی....''

''بھئی۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہماری برادری کے سب لوگ یہاں سے فی الحال بیرون وادی منتقل ہو رہے ہیں۔ چونکہ اس بات کو کوئی ہوا نہ لگے اس لئے ہم چپکے چپکے رات کے اندھیرے میں اپنا اہل وعیال اور گھریلو سامان لے کے یہاں سے جا رہے ہیں۔'' شبن جی نے کہا

''اچھا یہ تو بتاؤ۔ یہ صلح کس نے دی ہے۔'' میں نے پوچھا

''بھئی۔ نہ پوچھو اچھا ہے۔ ہاں صرف یہ سن لو کہ ہماری برادری کا یہ متفقہ فیصلہ ہے''۔ یہ کہکر شبن جی ٹرک کی طرف گیا اور میں سیدھے اپنے گھر کی طرف۔

شبن جی میرا ہم جماعتی بھی تھا اور دوست بھی۔ اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ دونوں فراغ تعلیم کے بعد دو مختلف محکموں میں ملازم ہو گئے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اسکی بیوی ریتا بھی میری بیگم کی دوست تھی اور وہ دونوں ایک ہی ادارے میں کام کرتی تھیں۔ اتفاق کی بات یہ بھی تھی کہ پرانے شہر سے نکل کر ہم نے شہر کے ایک پاش ایریا میں مکانات تعمیر کئے اور وہ بھی

ایکدوسرے کے نزدیک ایک ہی سڑک کے دوطرف۔ ہمارا آپس میں کافی ملنا جلنا اور آنا جانا تھا۔ ویسے ہمارے ایریا کے سبھی لوگ ایکدوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ اگر چہ نئی کالونیوں میں ایسا دیکھنے میں نہیں ملتا مگر چونکہ اس ایریا میں وہی لوگ بسنے آئے تھے جو پرانے شہر کے بسکین تھے اور ایکدوسرے کو پہلے سے ہی جانتے تھے اور شاید آپسی میل جول اور نزدیکی رابطے کی یہ ایک خاص وجہ تھی۔ بڑے امن امان سے رہتے تھے کبھی بھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا اور سبھی بڑے پیار و محبت سے اس ایریا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ پچھلے چند مہینوں سے پوری وادی کے حالات بگڑ گئے تھے اور لوگ شام سویرے ہی گھروں میں آکر بیٹھتے تھے یہ آپسی آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ ورنہ جب حالات معمول پر تھے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ کس گھر میں آج کونسی سبزی پکی، کونسا مہمان آیا ہے....

کھڑکی کو میں نے پھر کھولا یہ دیکھا کہ کیسے شبن جی نے مکان کے باہری گیٹ پر تالا لگایا اور اپنے بال و بچوں کو ٹرک میں بٹھا کر چل پڑا۔

دوسرے دن جب میری بیگم میکے سے لوٹی تو وہ یہ سُن کر ششدر رہ گئی کہ شبن جی کیسے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اُسے تعجب اس بات پر تھا کہ ریتا اُسے پوچھے بغیر کیسے چلی۔ اُسے غصہ بھی تھا مگر فکر مند بھی تھی۔

دو دن کے بعد ریتا کا فون آیا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ وادی سے باہر

اپنے ایک رشتہ دار کے پاس ٹھہرے ہیں۔

''ریتا۔تم نے بہت غلط کیا کہ گھر چھوڑ دیا۔اب اگر جانا بھی تھا کم ازکم مجھ سے مل کر جاتی''

''تمہیں کیا بتاؤں۔کن حالات میں گھر چھوڑنا پڑا۔کون چاہتا ہے کہ اپنا گھر بار چھوڑ دے۔اپنے لوگ،اپنی مٹی اور اپنا وطن۔بس یہ سمجھو کہ مجبوری تھی۔تمہیں فون پر کیا بتاؤں۔پھر بھی ہم ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر تو نہیں آئے ہیں۔صرف چند مہینوں کی بات ہے۔پھر واپس آئینگے۔پھر واپس آئینگے۔پھر مل جُل کر رہینگے.....'' ریتا فون پر بتا رہی تھی

''اچھا۔ریتا۔یہ تو بتاؤ کہ وہاں کسی چیز کی تمہیں ضرورت ہے۔پرائی جگہ پر ہو،مجھے بتاؤ میں بھیج دونگی.....''

''شکریہ بہن.....ہمیں یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ہم نے گھر سے ہر ایک چیز لائی ہے۔کپڑے،برتن،مصالحے،ٹی وی،فریج...سوئی تک۔سمجھو وہاں صرف اب چار دیواری ہے۔ویسے کوئی چیز رکھنے کا مطلب ہی نہیں تھا ایک تو یہاں اسکی ضرورت پڑتی اور دوسری وہاں وہ چیز ایسے ہی خراب ہو جاتی.....'' ریتا نے میری بیگم سے کہا۔

اب میرا جب بھی صبح شام شبن جی کے گھر سے گزر ہوتا تو میں ضرور ایک نظر اسکے مکان کے گیٹ پر ڈالتا۔جہاں اب دھول جمنے لگی تھی۔

مگر گیٹ کے باہر وہی کُتا ہوتا تھا جو شبن جی کے وقت بھی وہاں ہوا کرتا تھا۔ یہ کتا حسب عادت ہر اُس شخص پر بھونکتا جو گیٹ کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا۔ میں نے دو چار بار لاٹھی اٹھا کر اُسے وہاں سے بھگایا لیکن وہ پھر واپس آ کر اسی گیٹ کے سامنے بیٹھا۔

چھ ماہ بھی گذر گئے لیکن شبن جی واپس نہیں آیا۔ ایک سال گذر گیا اور۔ دو سال بھی گذر گئے۔ اتوار کا دن تھا سردی تھی مگر موسم صاف تھا، دھوپ کھلی تھی۔ میں نے شبن جی کو فون لگایا۔

''شبن جی۔ آداب۔ کیا حال ہے۔ اب تو گھر کو بھی بھول گئے ہماری تو بات ہی نہیں''

''بھئی کیا بتاؤں۔ تمہیں تو خود معلوم ہے کہ ابھی تک حالات ٹھیک نہیں ہوئے اور لگتا ہے کہ ابھی ٹھیک ہونے والے نہیں ہیں۔ ان حالات میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی ٹرانسفر یہیں کروادی اور ریتا کو بھی بڑی مشکل سے یہیں ایڈجسٹ کرادیا چھوٹے کو اکاڈمی میں داخل کیا۔ بڑا بیٹا تو اب کالج میں ہے بھئی ایک بتاؤں بُرا نہیں ماننا۔ یہاں آ کر میں نے نئی دنیا دیکھی۔ ہر قسم کی آزادی ہے۔ ہر سہولیت ہے، لوگ کافی ایڈوانسڈ ہیں، تعلیمی ماحول اچھا ہے، رہنے کو من کرتا ہے۔ سچ مانو اب من نہیں کرتا کہ واپس آ جاؤں۔ وہاں رکھا ہی کیا ہے۔ وہاں تو دم گھٹتا

ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح گھروں کے اندر سڑنا، کانگڑی اور فرن پہن کر اپاہج بن کے رہنا اور پھر بجلی کی آنکھ مچولی، گندی سڑی سبزیاں، گندہ ماحول ۔ ایکبار تم وہاں سے نکلو تو دیکھو باہر کی زندگی۔ نئی زندگی جی لو گے۔ وہاں یہ کیسے ممکن تھا کہ میرا بیٹا انجیرنگ کالج بمبئی میں سیٹ لے لیتا۔ یہاں ہماری ہی نہیں ہمارے بچوں کی زندگی میں بھی بہار آ گیا ہے۔ پہلے تو ہر اک شخص اپنے لئے جیتا ہے لیکن بچوں کے پیدا ہونے کے بعد اُن کے لئے جینا پڑتا ہے اور اب ہم بھی بچوں کے لئے جی رہے ہیں۔ ویسے بھی اب وہاں ہمارا کون ہے جسے ہماری آمد کا انتظار ہوگا''

شبن جی کہ یہ باتیں سن کر مجھے تعجب ہوا۔ یہ وہی شبن جی ہے جو اس وادی کو اپنے دل و جان سے زیادہ محبت کرتا تھا اس پر جان نچھاور کرنے .....کیسے بدل گئی ہے اسکی سوچ۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا ایک دفتری ساتھی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے اُسے پوری داستاں سُنا دی۔ وہ ہنس پڑا اور بولنے لگا۔

''میرے یار۔ تم بھی کتنے سیدھے اور نادان ہو۔ تمہیں کیوں تعجب ہو رہا ہے۔ یہاں سے جو لوگ نقل مکانی کر کے چلے گئے اُن سب کی یہی سوچ ہے اور یہ اکیلے شبن جی کی سوچ نہیں۔ انہیں تو وہاں مفت راشن، رہنے کی جگہ، ماہانہ نقدی رقم، بچوں کیلئے ملک کے اعلیٰ ترین کالجوں میں

مخصوص سیٹیں۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر کیوں آئینگے۔ ان کی تو لاٹری لگ گئی ہے۔ اُن کے پاس اللہ دین کا چراغ ہے۔ اب کیوں چھوڑیں وہ یہ سب کچھ.....''

باتیں تو سچ بتا رہا ہے۔ سولہ آنے سچ۔ لیکن معلوم نہیں مجھے تعجب کیوں ہو رہا تھا۔ میں اسکی باتیں سُن رہا تھا اور۔ اسی دوران باہر کسی گاڑی کی تیز بریک چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ ایک تیز رفتار سوموٹر نے شبن جی کے گیٹ کے نزدیک بیٹھے کتے کو کچل دیا تھا۔ گاڑی چل پڑی اور کتا اپنے لہولہان جسم کو گھسیٹتے گھسیٹتے شبن جی کے گیٹ کے پاس پہنچا اور دم توڑ دیا.....

میرے ساتھ بیٹھے دفتری ساتھی نے پوچھا کیا بات ہے

''کتا'' میرے منہ سے نکلا

☆☆☆

collection of stories

FAISLA ABHI BAQI HAY

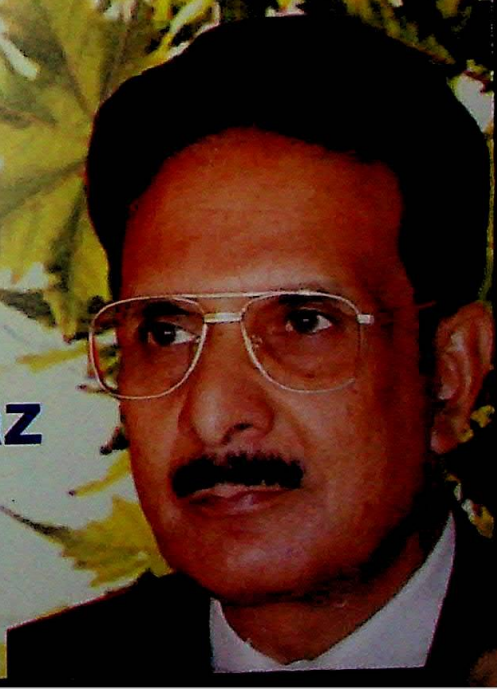

Dr. M. Shafi Ayaz